# تحت اللفظ

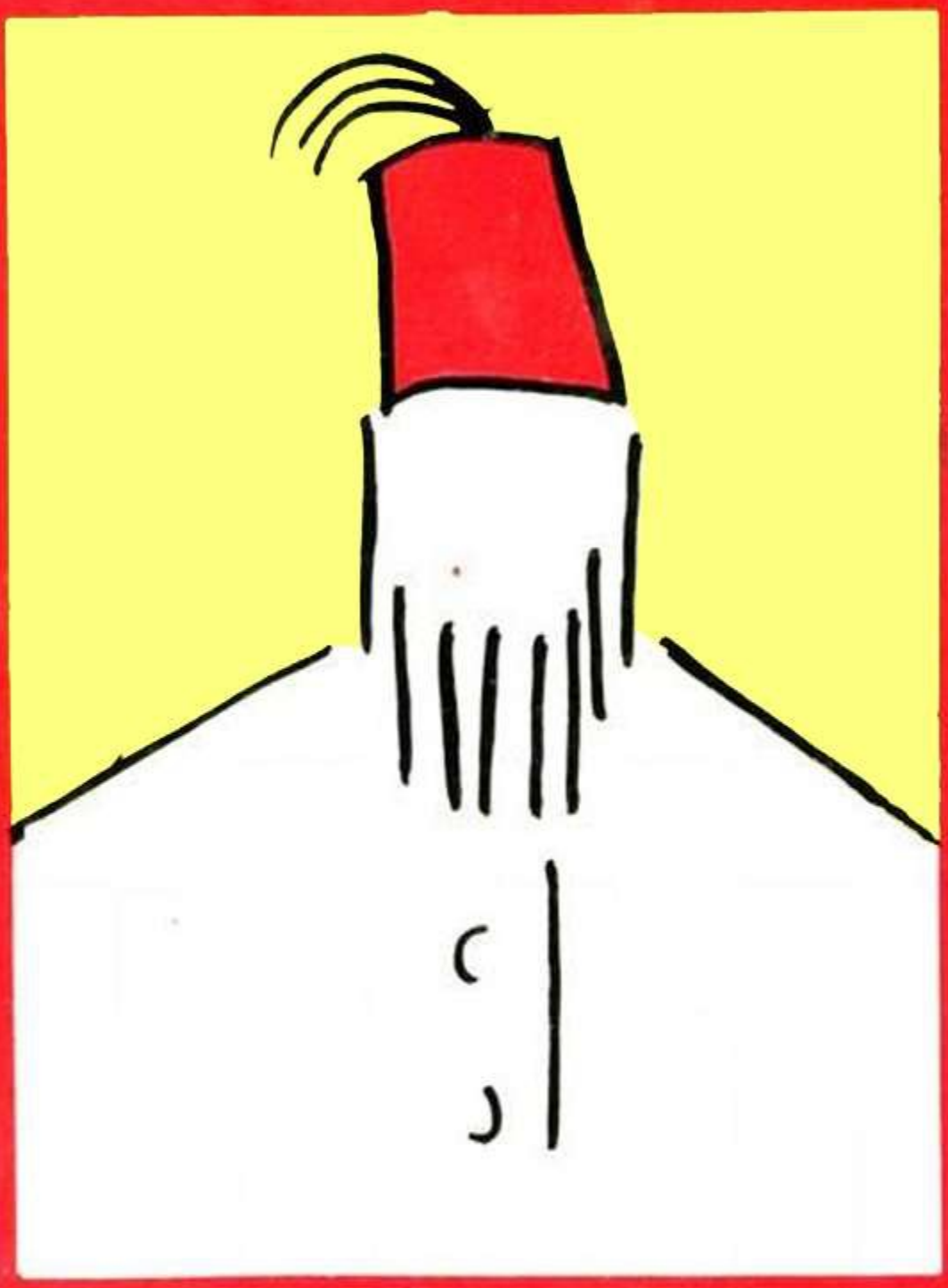



نصرت ظہیر

www.taemeernews.com

# تحت اللفظ

نصرت ظہیر

www.taemeernews.com

© جملہ حقوق بہ حق مصنف محفوظ ہیں

# TEHTULLAFZ

BY

NUSRAT ZAHEER
4/15 KHICHRIPUR COLONY DELHI -110091

بارِاوّل : ——— اگست ۱۹۹۲
قیمت : ——— ساٹھ روپے
تعداد : ——— ۱۰۰۰
صفحات : ——— ۱۶۰
سرِورق : ——— عتیق صدیق

زیرِاہتمام :
دنیا پبلی کیشنز۔ ۲۰۹ بی۔ دلشاد گارڈن ۔ دہلی ۱۱۰۰۹۵

ISBN - 81-85756-00-7

تقسیم کار
ابوالکلام ۴/۱۵ کھچڑی پور دہلی ۱۱۰۰۹۱
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ جامع مسجد دہلی

www.taemeernews.com

موہن چراغی

کے نام

جن کی پسند اور رہنمائی میرے لئے مشعلِ راہ بنی۔

آصف

کے نام

جو مجھ سے "تحت اللفظ" لکھواتی رہی لکھواتی رہی...

مگر یہ کتاب ترتیب دے کر

نہ جانے کہاں کھو گئی

اور

ان تمام گمنام مزاح نگاروں کے نام

جنہیں ابھی تک کوئی موہن چراغی نہیں ملا،

آصف نہیں ملی۔

www.taemeernews.com

# فہرست


| | |
|---|---|
| مقدمہ | ۵ |
| فخر سے کہو | ۹ |
| ایک گینڈا ڈیفنس کالونی میں | ۱۱ |
| مولوی یٰسین | ۱۴ |
| منشی ثناء احمد صبر و عصر | ۱۷ |
| (صنعتی شاعری) | ۲۱ |
| فضائل عینک | ۲۴ |
| ہم انٹلکچوئل کیسے بنے | ۲۷ |
| ایک آپنج کی کسر | ۳۲ |
| تیسری آنکھ | ۳۷ |
| داڑھی نامہ | ۴۰ |
| تکیہ کلام | ۴۳ |
| خرّاٹے | ۴۹ |
| (مزید خرّاٹے) | ۵۱ |
| دور درشن، اشتہار اور ہم | ۵۴ |
| دایاں بازو بایاں بازو | ۵۸ |
| (انتظار اور بھی) | ۶۰ |
| ہمیں شکایت ہے | ۶۲ |
| (جواب حاضر ہے) | ۶۹ |
| بابری مسجد رام جنم بھومی | ۷۱ |
| الٹا چکر | ۷۵ |
| سحری | ۷ |
| (افطار) | ۸۰ |
| فوٹو گرافی | ۸۳ |
| طلسمی انگوٹھی | ۸۸ |
| منزل دور نہیں | ۹۰ |
| (کمرشیل ازم) | ۹۲ |
| سگریٹ چھوڑنے کے نقصانات | ۹۶ |
| فون خراب ہے | ۱۰۰ |
| کرکٹ اور ٹاس | ۱۱۰ |
| مقامی انتخابات | ۱۱۵ |
| (جیت کا حساب) | ۱۱۷ |
| کلکتے کا جو ذکر کیا | ۱۲۰ |
| اردو کا دوسرا المیہ | ۱۲۸ |
| اردو کے اخبار | ۱۳۱ |
| مقامی اخبار | ۱۳۴ |
| ترجمے کے مسائل | ۱۳۷ |
| انصاف | ۱۴۴ |
| جنازے | ۱۴۸ |
| ہنسی | ۱۵۱ |
| افراط زر | ۱۵۵ |
| عالمی ریکارڈ | ۱۵۸ |

www.taemeernews.com



# مقدمہ

(۱)

قارئین کرام!

مقدمہ بازی کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ جو مقدموں میں پھنسا سمجھئے اس کا بیڑا غرق ہے۔ اور پھر یوں بھی ہم مسلمان آدمی ہیں۔ روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ معاملات کا جو فیصلہ ہونا ہے اسی روز ہو جائے گا۔ لہٰذا اس زندگی میں وکیلوں کی روزی بن کر دوزخ کا ایندھن کیوں بنیں۔؟

لیکن دوستوں کا اصرار تھا کہ کتاب چھپ رہی ہے تو ایک مقدمہ بھی ہونا چاہیئے کہ مقدمہ کے بغیر کتاب ایسی ہی ہے جیسے دلہن کے بغیر گھونگھٹ، سر کے بغیر ٹوپی، اور مجاہدین کے بغیر کلاشنیکوف، یہ مثالیں سُنکر ہم پر ایسی رقّت طاری ہوئی کہ فوراً مقدمہ کا فیصلہ کر لیا۔

اب سوال یہ تھا کہ مقدمہ لکھے کون۔؟ دوستوں سے رائے لی تو یہ دیکھ کر خوشی اور شک و شبہے کی انتہا نہ رہی کہ سب کے سب مقدمے لکھنے کو تیار تھے۔ خوشی یہ جان کر ہوئی کہ ہم اپنے دوستوں میں اب بھی مقبول ہیں۔ اور شک اس پر کہ سب کے سب مقدمے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ اور تو اور ایک روز ہمارے گھر کے آگے زبردستی پان بیڑی سگریٹ کا کھوکھا لگانے والے نے بھی سب کے سامنے کہہ دیا کہ وہ بھی ہم پر مقدمہ چلانا چاہتا ہے۔ ہم نے ہاتھ ملا کر اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ نہ جانے کیوں آنکھیں اور مُنھ پھاڑ کر ہمیں دیکھنے لگا۔!

اس روز ہم نے ایک ایک کر کے ہر پہلو کے تمام پہلوؤں پر بڑے غور سے غور کیا۔ اور غور کرنے کے بعد پایا کہ اپنے اوپر دوسروں سے مقدمہ چلوانے میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ برسوں پہلے پانی پت کے ایک بزرگ مفلر پوش مولانا نے مسدس حالی لکھتے لکھتے اردو شاعری پر مقدمہ چلوا دیا تھا۔ مقدمہ چلا اور ایسا چلا کہ آج تک اردو شاعری کا ایک شاعر بھی باعزت بَری نہیں ہوا ہے۔ ایک دو ہوئے بھی تو شبہ کے فائدے میں۔

لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنی کتاب کا مقدمہ خود ہی لکھیں گے۔ اس طرح فیصلہ بھی اپنے ہاتھ میں ہوگا اور سزا کا کھٹکا بھی نہ رہے گا۔ کسی اور سے مقدمہ لکھوانے میں خطرہ اس بات

www.taemeernews.com



کا بھی تھا کہ کہیں ہمارے ساتھ اوروں کو بھی سزا نہ ہوجائے۔ مثلاً شجاع خاور کو۔ او وہ سازشِ جرم میں اس طرح شریک ہیں کہ "قومی آواز" میں جس کالم کے تحت لکھے گئے مضامین کا یہ انتخاب ہے اس کا نام ان ہی کا رکھا ہوا ہے۔ موصوف نے پہلا مضمون شائع ہونے سے صرف دو چار منٹ پہلے ہماری درخواست پر آٹھ دس ناموں کا مشورہ دیا تھا۔ ان میں سے جو ہمیں سب سے مشکل لگا اس کا انتخاب کرلیا اور نتیجہ اب آپ بھگت رہے ہیں۔

اور شجاع خاور کو بھی چھوڑیئے، پولیس کے اعلیٰ افسر ہیں۔ کسی ترکیب سے بچ بھی جائیں گے بیچارے موہن چراغی کا کیا ہوگا۔ انھوں نے تو ارتکابِ جرم میں ان سے بھی بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ایک نوسیکھیے کو "قومی آواز" کے سب سے باعزت صفحہ پر جگہ دینا۔ دو چار روز مضمون نہ آئے تو اٹھتے بیٹھتے تقاضہ کرتے رہنا، اور ایک نرے صحافی کو زبردستی ادیبوں کی صفوں میں بیٹھنے کے لائق بنا دینا' اس کیلئے تو ان پر الگ سے کیس چل سکتا ہے۔ اس نئے مقدمے میں وہ اپنا بچاؤ کیسے کر پائیں گے؟

پھر جرم کیلئے 'اکسانے' یعنی حوصلہ افزائی کرنے والوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ بلکہ ہمیں تو شبہ ہے کہ ہمارے کاتب اور پبلشر صاحبان بھی لپیٹے میں نہ آجائیں۔ پس عافیت اسی میں تھی کہ دوسروں کے ہاتھ میں اپنی گردن دینے کی بجائے خود ہی یہ فرض ادا کرلیا جائے — تو لیجئے! تیار ہوجایئے۔ ! مقدمہ شروع ہوتا ہے۔

نہ نہ نہ ! گھبرایئے نہیں — یہ مقدمہ دیوانی عدالت میں نہیں ہے۔ جہاں فیصلہ، سائل اور جج کی آٹھ پشتیں نکل جانے پر بھی نہیں ہو پاتا۔ جی نہیں، ہم اتنے دیوانے نہیں کہ دیوانی عدالت میں جائیں۔ یہ مقدمہ تو سرسری عدالت میں سرسری طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ جس میں مدعی بھی ہم ہیں، مدعا علیہ بھی ہم ہیں۔ اس کے علاوہ وکیلِ استغاثہ، وکیل صفائی، ان کے منشی، عدالت کے محرر، یہاں تک کہ جج بھی ہم ہیں۔ لہٰذا سمن، تاریخ، پیشی اور سماعت وغیرہ کا جھنجھٹ بھی نہیں ہے۔ سیدھے سیدھے فیصلہ سُنانا ہے جو صرف ایک جملے پر مشتمل ہے۔

اور فیصلہ یہ ہے کہ :-

"پڑھنے والے کے سوا ہر شخص کو اس مقدمے سے باعزت بری کیا جاتا ہے۔"

دستخط :- مصنف کتاب ہٰذا یعنی نصرت ظہیر صاحب

www.taemeernews.com



اس مجموعے میں شامل مضامین روزنامہ قومی آواز نئی دہلی کے مقبول ترین فکاہیہ کالم "تحت اللفظ" (آغاز اشاعت جولائی ۱۹۸۸ء) سے لیے گئے ہیں۔ یوں تو مصنف کتاب ہٰذا (یعنی راقم الحروف) کا ہفتہ وار کالم "دہلی ڈائری" بھی بے حد مقبول ہوا لیکن اس کی شناخت "تحت اللفظ" سے ہی ہوئی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب سے اس یومیہ کالم کی اشاعت موقوف ہوئی ہے کچھ لوگوں نے مصنف کو پہچاننا ہی بند کر دیا ہے۔

دستور ہے کہ جب کسی ادیب کی پہلی کتاب شایع ہوتی ہے تو وہ دیباچے میں بہت سی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کچھ لوگوں کا شکریہ ضرور ادا کرتا ہے۔ ادیب بننے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ لہٰذا راقم الحروف (یعنی مصنف کتاب ہٰذا) بھی ان احباب اور کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتا ہے جنھوں نے یہ کتاب شائع کرائی یا مضامین کی بار بار تعریف کر کے مصنف کا حوصلہ بڑھایا۔ اس سلسلہ میں "عصری آگہی" اور "چنگاری" والے بشیر احمد اور نہایت غصّہ والے حسن امیر کا ذکر ضروری ہے جو دونوں زمروں میں شامل ہیں۔

دوسرے زمرہ کے کرم فرماؤں کی فہرست طویل ہے۔ ان میں: بیر رضوی، شمس الزماں، مجتبیٰ حسین، دلیپ سنگھ، سید شریف الحسن نقوی، پارس ناتھ بلی، ظفرالدین، عتیق صدیقی، وجیہہ الدین ملک، ڈاکٹر خلیق انجم، پیغام آفاقی، م۔ افضل، ماموں ابونعمان، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر نصیر احمد خاں، ڈاکٹر قمر رئیس، حیات لکھنوی، مودود صدیقی، معین اعجاز، انور عظیم، عبدالحمید وارثی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، دور درشن والے انجم عثمانی اور افسانہ نگار انجم عثمانی سے لے کر خالص و مخلص انجم عثمانی تک اتنے شاعر، ادیب، ڈاکٹر اور مریض شامل ہیں کہ سب کا ذکر محال ہے اس لیے مصنف کسی کا بھی ذکر نہیں کر رہا ہے۔ موہن چراغی اور شجاع خاور کا ذکر اوپر آچکا ہے لہٰذا ان کا ذکر بھی نہیں کیا جا رہا ہے۔

تاہم آخر میں والد محترم قبلہ شاہ عبدالعزیز قادری کا ذکر لازم ہے جنھوں نے ان تحریروں پر خاموش اظہار پسندیدگی سے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

میں ان سب حضرات کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

راقم الحروف نصرت ظہیر بقلم خود نئی دہلی

www.taemeernews.com



# فخر سے کہو

خواہ آپ کسی بھی قصبے یا شہر میں رہتے ہوں، گھر سے نکل کر ذرا دیواروں پر نظر ڈالتے چلیں گے تو ایک فرلانگ میں ہی آپ کو احساس ہو جائے گا کہ آج کل اس ملک میں فخر کرنے پر کافی زور دیا جا رہا ہے۔ دیواروں پر مختلف زبانوں میں نعرے لکھے ملیں گے جن میں ایک ہی بات کہی گئی ہوگی کہ فخر سے کہو ہم یہ ہیں، فخر سے کہو ہم وہ ہیں۔

کوئی بھی تنظیم ہو، کوئی بھی جماعت ہو، سب کی ضد ہے کہ ہم کچھ نہ کچھ فخر سے ضرور کہتے رہیں۔ .

مثلاً۔ کسی کا حکم ہے، فخر سے کہو ہم ہندو ہیں
کسی کا فرمان ہے فخر سے کہو ہم سکھ ہیں
کسی کی تلقین ہے، فخر سے کہو ہم عیسائی ہیں
کسی کی تاکید ہے فخر سے کہو ہم مسلمان ہیں
اور آگے بڑھئے تو فخر سے کہو ہم پارسی ہیں

فخر سے کہو ہم جین ہیں، فخر سے کہو ہم بودھ ہیں جیسے نعرے بھی لکھے مل جائیں گے۔

شریف آدمی بے چارہ ان نعروں کو پڑھ کر مشکل میں پڑ جاتا ہے اور ہر وقت یہی سوچتا رہتا ہے کہ وہ اکیلی جان آخر فخر سے کیا کیا کہے؟

کہتے ہیں، ایک شہر میں ایک غیر ملکی آیا تو ان نعروں کو پڑھ کر بڑا حیران ہوا۔ اپنی حیرانی دور کرنے کے لیے اس نے کسی سے پوچھا "کیوں بھائی یہ فخر صاحب کون ہیں اور ان سے اتنی ساری باتیں کہنا کیوں ضروری ہے؟"

غیر ملکی کی بات سن کر اس آدمی کو غصہ آگیا اور اس نے مکّا تان کر کہا: "ابے سالے غیر ملکی تم ہماری قدیم تہذیب اور ثقافت کا مذاق اڑاتے ہو؟ تمہاری یہ ہمّت؟"

"ویل — آئی ایم ساری مائی ڈیر —" غیر ملکی اس کا غصّہ دیکھ کر گھبرا گیا۔

www.taemeernews.com


" ابے ۔ مجھے ڈمر کہتا ہے ۔ تیری یہ ہمت ؟ نکال سالے جو کچھ ہے تیری جیب میں ۔ ورنہ ابھی ڈھیر کر دوں گا "

غیر ملکی نے چاقو تنا ہوا دیکھ کر بٹوا نکال لیا اور اگلی ہی صبح اپنے ملک واپس چلا گیا۔

میں نے ایک دانشور سے پوچھا " قبلہ یہ تو بتائیے کہ آخر یہ فخر کی لہر کیوں آئی ہوئی ہے اس ملک میں ۔ آپ کا کیا خیال ہے ہمارے معاشرے پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے ؟"

دانشور نے بڑی نزاکت سے اپنے گنج کو سہلایا ۔ بنا شکر کی چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور بولا " جو قومیں تہذیبی انحطاط کے دور سے گزرتی ہیں ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے ۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہوتی ہیں جس سے ان میں برتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور دوسری قوموں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے لیے وہ اپنی برتری کا اظہار شروع کر دیتی ہیں جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ غیر منطقی نظریات میں پناہ ڈھونڈنے لگتی ہیں ۔ جب دوسری قومیں یہ دیکھتی ہیں تو ان میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے اور اپنے تحفظ کے لیے وہ قومیں تشخص کی بات کرنے لگتی ہیں اور یہیں سے تفخر کی لہر شروع ہو جاتی ہے تفخر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ..... "

" بس بس اتنا ہی کافی ہے ۔ صرف یہ بتا دیجئے کہ اس لہر سے کوئی خطرہ تو نہیں ہے " میں نے پوچھا۔

" نہیں ۔ خطرہ وطرہ کچھ نہیں ہے بلکہ اس سے تو ملک کو فائدہ ہی ہوگا ۔ انفرادی قومی تفخر سے اجتماعی قومی تفخر کی راہ استوار ہوگی اور اس سے ....." دانشور کا جواب پورا ہونے سے پہلے ہی میں چپکے سے کھسک آیا۔

فخر کرنا کوئی بری بات نہیں ۔ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق جس چیز پر چاہے فخر کر سکتا ہے ۔ بلکہ سچ پوچھئے تو فخر کرنا ہمارا پیدائشی حق جنم سدھ ادھیکار ہے لیکن ہر چیز کا ایک ضابطہ ہوتا ہے (بعض دانشوروں کے مطابق تو ضابطوں کا بھی ضابطہ ہوتا ہے) لہٰذا فخر کرنے کا بھی کوئی قاعدہ قانون ہونا چاہیے ۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک میں آزادیاں تو بہت ہیں لیکن ان کو استعمال کرنے کے ضابطے کم ہیں چنانچہ فخر کرنے کے معاملے میں بھی بڑی افراتفری دیکھنے میں آتی ہے ۔ لوگ اپنے ہاں تو فخر کرتے ہی ہیں، دوسروں کے ہاں بھی فخر کرنے پہنچ جاتے ہیں جس کا غیر منطقی نتیجہ فخر کے تصادم کی شکل میں نکلتا ہے ۔ مثلاً مسلمان ہندوؤں کے علاقے میں فخر کرتا ہے تو ہندو مسلمانوں کے علاقے میں فخر کرنے پہنچ جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں پی اے سی، کرفیو، فائرنگ اور عدالتی تحقیقات کی نوبت آجاتی ہے ۔

امید کرنی چاہیے کہ حکومت اس جانب فوراً توجہ دے گی اور جلد از جلد ۔ یعنی آئندہ پندرہ بیس سال میں اس سلسلہ میں کوئی نہ کوئی قانون ضرور بن جائے گا۔

www.taemeernews.com


# ایک گینڈا ڈیفنس کالونی میں

دہلی انتظامیہ ابھی تک یہ نہیں جان پایا ہے کہ اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایرپورٹ کی طرف ایک پنجرے والی لاری میں بند کر کے امریکہ کے اوکلاہوما چڑیا گھر لے جائے جانے والے ۴ سالہ افریقی گینڈے کے سر پر اچانک پاگل پن کیوں سوار ہو گیا تھا ؟ کوئی کہتا ہے کہ یہ چار ٹن وزنی گینڈا ہوائی جہاز سے سفر کا موقع ملنے کی خوشی سے پاگل ہو گیا تھا تو دوسرا فوراً بات کاٹ کر کہہ دیتا ہے کہ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ گینڈے کے پاگل پن کا تعلق ہوائی سفر سے ضرور تھا لیکن اس کی وجہ خوشی نہیں تھی۔ بلکہ اسے یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ یہ سفر اسے ایرانڈیا کے طیارے میں کرنا ہوگا۔

ایک ترقی پسند ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ گینڈا جنوبی افریقہ کے کسی جنگل سے دہلی کے چڑیا گھر میں لایا گیا تھا اور امریکہ لے جائے جانے پر نسل پرست پریٹوریا حکومت کی سرپرستی کرنے والی امریکی حکومت کے خلاف اپنی دلی نفرت کا اظہار کر رہا تھا۔ لیکن حال ہی میں واشنگٹن میں منعقدہ ایک سمینار میں شرکت کر کے آنے والے ایک جدیدیت پسند مفکر نے رائے دی کہ چڑیا گھروں میں جانوروں کے حقوقِ انسانی چھین لیے جاتے ہیں چنانچہ گینڈے کا پاگل پن دراصل اس دنیا کے چڑیا گھرانہ نظام کے خلاف احتجاج کی علامت تھا۔

ایک اور صاحب بڑی دور کی کوڑی لائے۔ کہنے لگے کہ گینڈے کے پاگل پن کی وجہ ڈیفنس کالونی تھی! ہم نے پوچھا۔ کیسے ؟ وہ بولے۔ ایسے کہ راستے بھر گینڈا خاموش اور پُرسکون رہا لیکن اسے لمبے چوڑے پنجرے میں بند کر کے لے جانے والی لاری جیسے ہی ڈیفنس کالونی میں داخل ہوئی، دہلی کی دیگر گندی کالونیوں کے مقابلے میں اس کالونی کی صاف ستھری فضا دیکھ کر اس کا دماغ اُلٹ گیا۔

لیکن ہمارا ذہن ان دلیلوں کو قبول نہ کر سکا۔ آخر کار ہم نے میاں عبدالقدوس سے رجوع کیا کہ ہماری بیشتر نظریاتی اور مفکرانہ و مدبرانہ الجھنوں کا حل اور علاج ان ہی کی ذاتِ گرامی

www.taemeernews.com



کی بدولت ہو پایا ہے۔ ہم نے پوچھا "بندہ پرور پچھلے ہفتے ۱۸ سال کے گینڈے نے اچانک پاگل ہو جانے پر اودھم مچا کر سرِبازار اپنا ۱۴ فٹ لمبا، ۶ فٹ اونچا اور ۵ فٹ چوڑا پنجرا توڑ دیا تھا۔ کچھ اس کی وجہ پر روشنی ڈالیے۔"

خاں صاحب نے حسبِ عادت ہمیں غور سے گھور کر دیکھا اور بولے "ہشت ــــ وہ گینڈا نہیں تھا، گینڈی تھی۔ کیسے اخبار والے ہو تم؟ تذکیر و تانیث بھی نہیں جانتے۔"

"چلیے مادہ گینڈا ہی سہی" ہم نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

"کیا کہا؟ ــــ مادہ گینڈا ــــ یعنی اب تم اردو زبان کا بھی بیڑا غرق کرنے پر تُلے ہوئے ہو؟" خاں صاحب گرج اٹھے۔

"معاف کیجئے خاں صاحب۔ یہ آپ سراسر زیادتی کر رہے ہیں۔ اردو میں چونکہ گینڈی کا لفظ موجود نہیں ہے اس لیے نر گینڈا اور مادہ گینڈا از روئے گرامر درست ہے۔ زبان کا بیڑا تو معاف کیجئے، گینڈی جیسے بے سر و پا الفاظ داخل کرنے سے غرق ہوگا۔" ہم نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"چہ خوب۔ چہ خوب۔ یعنی اگر تمہاری دلیل مان لی جائے تو مرغی کو مادہ مرغ، اونٹنی کو مادہ اونٹ، عورت کو مادہ مرد اور بیوی کو مادہ شوہر کہنا بھی ٹھیک ہوگا۔ اسی طرح بکرے کو نر بکری، ہاتھی کو نر ہتھنی اور پلنگ کو نر چارپائی کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔"

"اُفوہ ــــ بھئی خاں صاحب آپ تو بات کو لے اڑے۔ چلیے آپ کی ہی بات سہی اب اصل موضوع پر آئیے۔"

"کیا تھا اصل موضوع؟" انھوں نے پوچھا۔ ہم نے پھر بتا دیا کہ گینڈے کا پاگل ہونا اور پھر چڑیا گھر کے عملے اور درجنوں پولیس والوں کی موجودگی میں گھنٹوں تک اس کا اودھم مچانا ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ خاں صاحب نے ماتھے پر سلوٹیں ڈال کر چند لمحے غور کیا پھر بولے۔

"دیکھو بھائی، تم نے گینڈے کے ساتھ پولیس والوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان دونوں کی نفسیات کو نہ آج تک کوئی سمجھ سکا ہے نہ شاید سمجھ پائے گا۔ پولیس کے بارے میں علامہ اقبال نے ہار مان کر کہہ دیا تھا کہ۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔ میرا خیال ہے کہ گینڈے کے بارے میں بھی یہی کہنا پڑے گا۔ ویسے تم چاہو تو اس سلسلے میں تمہیں ایک تھانے کا سچا واقعہ سنا سکتا ہوں۔"

www.taemeernews.com


"سنایئے!"

"ہوا یہ کہ ایک دن ایک پولیس والا اخبار میں ایک گینڈے کی تصویر دیکھ کر غصّے سے آگ بگولا ہوگیا۔ وہ ڈیوٹی آفیسر کے پاس گیا اور بولا۔ صاحب میری رِوانگی نہ لکھئے گا۔ میں ابھی ایک آدمی کی مرمت کرکے دس منٹ میں واپس آتا ہوں۔ آفیسر نے پوچھا۔ کیوں بھئی آخر کیا بات ہے پولیس والا بولا۔ صاحب اس شخص نے پانچ سال پہلے مجھے گینڈا کہا تھا۔ افسر بڑا حیران ہوا۔ اس نے کہا۔ بھیّا اس نے تمہیں پانچ سال پہلے گینڈا کہا تھا اور غصّہ تمہیں آج آرہا ہے اس کی وجہ؟ تو پولیس والے نے جواب دیا۔ صاحب گینڈا میں نے آج ہی دیکھا ہے۔"

"لیکن خاں صاحب اس واقعہ سے گینڈے کے پاگل پن کا کیا تعلق؟"

خاں صاحب نے ایک بار پھر ہمیں گھورا اور بولے: "تعلق ہے بھئی۔ کمال ہے تم اب بھی نہیں سمجھے! ارے بھئی سیدھی سی بات ہے لاری کے پنجرے میں جاتے ہوئے گینڈے کی نظر کسی پولیس والے پر پڑ گئی ہوگی بس! اور کیا؟ یہ عجیب الخلقت چیز دیکھ کر گینڈے کا دماغ اُلٹ گیا ہوگا۔"

www.taemeernews.com


# مولوی یٰسین

جب کبھی ان اساتذہ کا خیال آتا ہے جن کی بدولت ہم دولتِ علم سے مالا مال ہوئے تو سب سے پہلا نام یاد آتا ہے مولوی یٰسین کا !!

مولوی یٰسین ہلالی ۔ پچپن ساٹھ کا سن ، دُبلا پتلا جسم ، سانولا رنگ ، کثرتِ پان سے سیاہ دانت' بدن پر میل سے چکٹ اور پیک سے گلزار کرتا پاجامہ ، پیروں میں سلیم شاہی جوتی' سر پر کبھی ٹوپی تو کبھی سر سے دو گنے وزن اور حجم کی پگڑی اور یہ سب جوڑ کر بمشکل چار فٹ کا قد اور کلو گرام میں عمر سے آدھا وزن ۔

یہ تھے مولوی یٰسین ! دیکھنے میں انتہائی نحیف و نزار اور معمولی انسان نظر آتے تھے مگر ہیبت کا یہ عالم تھا کہ جب کلاس لینے کے لیے ٹیچرز روم سے باہر نکلتے تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی تھی ۔ بچے اپنی اپنی کلاسوں میں چلے جاتے تھے ۔ یہاں تک کہ امرود اور جامن کے درختوں پر چہچہانے والی چڑیاں بھی خاموش ہو جاتی تھیں ۔

مولوی یٰسین اردو پڑھاتے تھے اور صحیح معنوں میں اردو کے ٹیچر تھے ۔ صحیح معنوں میں اس لیے کہ ان کا درس کبھی اردو کی گرامر سے آگے نہیں بڑھا ۔ اپنے پیریڈ میں نہ کبھی انھوں نے غالب اور اقبال کا ذکر کیا نہ انیس و دبیر میں مقابلہ کرایا ! ان کے تو بس دو ہی کیرکٹر تھے ۔ حلد اور محمود ! چنانچہ ان کا پورا پیریڈ اسی بحث میں ختم ہو جاتا تھا کہ حامد اسکول کیوں جاتا ہے ۔ اور محمود اسکول کیوں نہیں جاتا ! یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایک دوست شاہ محمود نے ان کی کلاس کبھی اٹینڈ نہیں کی ۔ (آج کل وہ قصبہ بہٹ کی ٹاؤن کمیٹی کے چیرمین ہیں )

لیکن وہ پڑھاتے تب تھے جب ان کے منھ میں پان نہ ہو اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا ۔ جس طرح چین اسموکر سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا جاتا ہے اسی طرح وہ ایک پان کی پیک ختم ہونے سے پہلے منھ میں دوسرے پان سے کمک پہنچاتے رہتے تھے ۔ کبھی کبھار کسی وجہ سے یہ سلسلہ ٹوٹ جاتا تو درمیانی وقفے میں اردو کی گرامر پڑھا دیتے تھے ۔ پان وہ اس قدر کھاتے تھے کہ ہم نے

www.taemeernews.com



انھیں پان کے سوا کبھی کچھ کھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سُنا ہے صبح کی چائے ضرور پیتے تھے لیکن اس کے بعد ناشتہ ہو یا لنچ یا ڈنر ـــــ سب پان پر ہی مشتمل ہوتا تھا۔ یہ بھی سُنا ہے کہ بازار نخاسہ میں جہاں وہ رہتے تھے ہمیشہ ایک خاص پنواڑی سے پان بندھواتے تھے اور ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ لیکن وضعدار ایسے تھے کہ جب بھی تنخواہ ملتی تو ساری تنخواہ پابندی سے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ کبھی کبھی پنواڑی انھیں چھیڑنے کے لیے کہہ دیتا ـــ "مولوی صاحب آپ تو خواہ مخواہ کالج جاتے ہیں، جب ساری تنخواہ مجھی کو دینی ہے تو مجھے حکم دیجئے میں کلاس میں پڑھا آیا کروں گا آپ یہاں بیٹھ کر پان لگاتے رہیے! اس پر مولوی یٰسین اسے ایک آنکھ سے گھور کر دیکھتے (دوسری کسی حادثے کی نذر ہو گئی تھی) اور اگر منھ میں پان نہ ہو تو عربی یا فارسی میں ایسی وزنی گالی دیتے کہ پنواڑی کی روح تک کانپ اٹھتی۔ خبیث الدہر یا خبیث الدہر کا بچہ ان کی محبوب گالی تھی۔

مولوی صاحب میں ایک وصف اور تھا۔ وہ دائیں اور بائیں دونوں ہاتھوں سے یکساں انداز تحریر میں لکھ سکتے تھے اس طرح وہ بیک وقت رائٹسٹ بھی تھے اور لیفٹسٹ بھی۔ کلاس میں آتے ہی ان کا سب سے پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ بلیک بورڈ پر دائیں ہاتھ سے آدھا جملہ لکھ کر اسے بائیں ہاتھ سے پورا کرتے اور پھر لڑکوں سے پوچھتے "ابے احمقو! کیا تم نے اور کسی کو ایسے دونوں ہاتھوں سے لکھتے ہوئے دیکھا ہے جیسے تمہارا استاد لکھتا ہے!" پوری کلاس بیک آواز "نہیں" کہہ کر جواب دیتی جس کے بعد خوش ہو کر وہ دو تین پان ایک ساتھ منھ میں رکھ لیتے اور تین چار لڑکوں کو دروازے کے قریب مرغا بنا کر آرام سے کرسی پر بیٹھے جگالی کرتے رہتے تھے۔ لڑکوں کو مرغا اس لیے بنایا جاتا تھا کہ اگر پرنسپل صاحب معائنے کے لیے آئیں تو سمجھ جائیں کہ کلاس چل رہی ہے۔

اس کے باوجود مولوی صاحب کا ریکارڈ سب سے اچھا رہتا تھا۔ ان کی کلاس کا ہر لڑکا اور چاہے جتنے مضامین میں فیل ہو مگر اردو میں پاس ہوتا تھا۔ ایسا سو فی صد رزلٹ اور کسی مضمون میں نہیں آتا تھا اور ان کی کلاس کے سو میں سے سو لڑکے پاس ہو جاتے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو یہ ہوا کہ رزلٹ سو فی صدی سے بھی آگے بڑھ گیا اور کلاس کے کل چالیس لڑکوں میں سے پینتالیس پاس ہو گئے۔ اس پر کافی ہنگامہ ہوا۔ جانچ پڑتال ہوئی تو پتہ چلا کہ زائد لڑکوں کے سیکشن بدل گئے تھے اور وہ بیک وقت دو دو کلاسوں میں پاس ہو گئے تھے لیکن مولوی صاحب

www.taemeernews.com



کے رجسٹر میں سب کے نام درج تھے !

پرنسپل صاحب جب کبھی انھیں یہ تاکید کرتے کہ مولوی صاحب کم سے کم دو چار بچوں کو تو فیل کر دیا کیجئے۔ تو ان کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا " جب تک مولوی یٰسین زندہ ہے اس کے قلم سے کوئی لڑکا فیل نہیں ہوگا ! اگر آپ کو شک ہے کہ میں نے کسی کو جان بوجھ کر پاس کیا ہے تو کاپیاں دیکھ لیجئے" اور واقعی جب کاپیاں دیکھی جاتیں تو پتہ چلتا کہ مولوی صاحب نے کسی کے ساتھ رعائت نہیں برتی تھی۔

جس روز مولوی یٰسین کا انتقال ہوا۔ پورا کالج سوگ میں ڈوبا تھا۔ ہر نگاہ چھوٹے سے قد کے اس آدمی کو ڈھونڈ رہی تھی جس کے بغیر کالج کا تصور بھی مشکل تھا۔ تمام طلبا پلے گراؤنڈ میں جمع تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ یہاں تک کہ امرود اور جامن کے درختوں پر بھی خاموشی چھائی تھی۔

اس واقعہ کو بیس برس گزر گئے مگر آج بھی ہر سال عید کی نماز کے لیے عیدگاہ جاتے وقت جب اسلامیہ انٹر کالج کے سامنے سے گزر ہوتا ہے تو کالج کے مینار دیکھ کر مولوی یٰسین یاد آجاتے ہیں اور سر احترام سے جھک جاتا ہے کہ وہ بھی کالج کے ایک مینار ہی تو تھے۔

www.taemeernews.com


# منشی ثنا احمد صبر و عصر

ہمارے علم کے مطابق ابن انشاء نے اپنی تحریروں میں کم از کم دو مقامات پر شہر سہارنپور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس شہر کی دو چیزیں بڑی مشہور ہیں ایک یہاں کے آم اور دوسرا منشی ثنا احمد صاحب کا دیوانِ صبر و عصر۔

ہمیں جن ہستیوں کو ان کی زندگی میں دیکھنے پر فخر ہے ان میں شیخ مختار فلم ایکٹر، شاہ نور خاں کاتب اور بھورے ماسٹر ٹیلر اینڈ سنز کے علاوہ ایک نام منشی ثنا احمد صبر و عصر کا بھی ہے۔ چوتھائی صدی پہلے انھیں ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں انتہائی ضعیفی کے عالم میں دیکھا تھا۔ ایک کھرّی چارپائی پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ عمر پچھتر کو پار کر چکی تھی۔ بصارت اور سماعت نے جواب دے دیا تھا۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔ (سوائے عبدالقیوم شاعر کے جو پابندی سے ان کی خدمت کے لیے آتے رہتے تھے) نہ کوئی آمدنی تھی نہ ذریعہ معاش تھا کئی جسمانی اور روحانی تکلیفوں میں مبتلا تھے۔ مگر مفلسی اور حالات کی چکی میں پستے ہوئے بھی مشقِ سخن جاری تھی۔ کوئی بھولا بھٹکا ملنے آجاتا تھا تو اسے اپنا حال بعد میں تازہ اشعار پہلے سُناتے تھے۔

ہم جب ان کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو وہ استاد عبدالقیوم شاعر کو ڈانٹ رہے تھے۔

"ارے عبدالقیوم۔ کبھی کوئی ڈھنگ کا شعر بھی کہہ لیا کر! کیوں شاعری کا نام بدنام کرتا ہے"

"اچھی بات ہے استاد۔ کوشش کروں گا" استاد عبدالقیوم کہہ رہے تھے (اس دوران ہم منشی جی کے پائنتی رکھے ایک شکستہ اسٹول پر بیٹھ چکے تھے مگر سماعت و بصارت کمزور ہونے کے سبب انھیں ہمارے آنے کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔)

"اور دیکھ، اس جدید ودید شاعری کے چکر میں ہرگز مت پڑیو! ایسی شاعری کبھی مت کیجیو جس سے استاد شاہ نصیر اور استاد ذوق کی روح کو تکلیف پہنچے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیو کہ حشر کے روز جدید شاعروں کی مغفرت نہیں ہوگی"

پھر اچانک ہماری طرف بوڑھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولے — "ارے بھئی یہ کیا رکھا

www.taemeernews.com



ہے یہاں حقہ سا!؟"

"حقہ نہیں استاد بچہ ہے۔ آٹھویں میں پڑھتا ہے اور آپ سے ملنے کا مشتاق ہے۔"

"بھئی معاف کرنا بیٹے۔ بوڑھا ہوں۔ ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا۔ اور سناؤ کیسے ہو؟ کچھ شعر وعر کہتے ہو؟"

"جی بس کچھ ایسے ہی ٹوٹے پھوٹے مصرعے نکال لیتا ہوں۔" ہم نے کہا۔

"کس سے اصلاح لیتے ہو" منشی جی نے کان پر ہاتھ رکھ کر ہمارا جواب سننے کے بعد پوچھا۔

"جی کسی سے نہیں!"

"ہائیں۔ شعر کہتے ہو اور کسی سے اصلاح نہیں لیتے۔ یعنی بے اُستادے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"استغفراللہ۔ میاں کچھ معلوم بھی ہے جو شخص کسی کو استاد بنائے بغیر شعر کہتا ہے نیکی کے فرشتے اس کے قریب نہیں آتے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جلد سے جلد کسی کو استاد بنالو" منشی جی نے کہا۔ پھر استاد عبدالقیوم سے مخاطب ہو کر بولے۔ "ارے عبدالقیوم۔ بھئی میرا خیال ہے کہ فی الحال اس لڑکے کو تم اصلاح دے دیا کرو۔ بے چارہ کہیں جدیدیوں کے چکر میں پڑ کر عاقبت نہ خراب کر بیٹھے۔"

"بہتر ہے استاد۔"

"اور دیکھو اصلاح دینے میں تساہل کبھی نہ دکھانا تو آموز شاعروں کو اصلاح دینا بڑے ثواب کا کام ہے۔"

"بجا کہا استاد!"

ایسے تھے منشی ثنا احمد صاحب۔ جن کے لیے شاعری ہی اوڑھنا اور شاعری ہی بچھونا تھی شاعری وہ اس طرح کرتے تھے جیسے کوئی صوفی عبادت کرتا ہے، دنیا کی تمام باتوں سے بے پروا نہ انھیں کھانے پینے کی فکر رہتی تھی نہ پہننے کی جو مل گیا کھالیا جو میسّر آگیا پہن لیا۔ نہیں تو صبر کر کے گزار دی۔ نہ کبھی حرف شکایت زبان پر لائے نہ کسی کے آگے اپنا رونا رویا یوں ہی چپ چاپ دنیا سے چلے گئے۔

ان کا دین و ایمان فقط شاعری تھی اور شاعری بھی ایسی ویسی نہیں سنگلاخ زمینوں ادق مضامین اور دماغ چکرا دینے والے صنایع و بدایع کی شاعری: نعت رقطا فوق النقات تحت النقاط

www.taemeernews.com


واسع الشفتین واصل الشفتین اور متعدد دیگر صنعتوں کی شاعری ہے، جس سے دیوان صبر و عصر بھرا پڑا ہے۔

جب پہلی بار ابوالبقار منشی ثنار احمد صبر و عصر کا نام ہم نے سُنا تھا تو یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ حسن لال بھگت رام شنکر جے کشن اور کلیان جی آنند جی کی طرح کیا اب شاعروں کی جوڑیاں بھی پیدا ہونے لگی ہیں لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ یہ دو نہیں ایک ہستی ہیں تو ہم اس طرح شرمندہ ہو گئے جس طرح سیٹھ مگن بھائی چھگن بھائی ــ تیل والا سے ملاقات کے وقت ہوئے تھے۔ (انھیں بھی ہم دو سیٹھ سمجھ بیٹھے تھے)

دو تخلص رکھنے کا بھید دیوان صبر و عصر پڑھ کر کھلا جس کا تاریخی نام "بہار بے نظیر" ۱۳۸۰ھ تھا اور جو برقی پریس دہلی سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔ منشی جی نے یہ مجموعہ بڑی کاوشوں سے اور بعض لوگوں کے مطابق اپنی تمام جمع پونجی بیچ کر طبع کرایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دیوان طبع ہوتے ہی ادبی دنیا میں ان کی دھوم مچ جائے گی اور لوگ مجموعے کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ مگر افسوس ایسا نہیں ہوا۔ دیوان صبر کی ہزاروں جلدیں بوریوں میں بند پڑی رہیں اور اس کے وہ صفحات جن پر منشی جی کا تمام فن تقریباً چھ سو غزلوں کی صورت میں بکھرا ہوا تھا چوہوں کی خوراک بنتے رہے۔

منشی جی ۱۰ر مئی ۱۸۸۶ء کو سہارنپور میں پیدا ہوئے تھے۔ مکتب سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے امبہٹہ کے انگریزی اسکول اور امبہٹہ کے انجنیرنگ کالج میں جدید تعلیم بھی حاصل کی، مگر ان کی شاعرانہ طبیعت نے جدید تعلیم کا کوئی اثر قبول نہیں کیا وہ ایک مس پلیسڈ پرسنالٹی تھے جسے قدرت نے ایک غلط دور میں پیدا کر دیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر منشی جی اور پچاس برس پہلے پیدا ہوئے ہوتے تو ان کا مجموعہ کلام منشی نولکشور کے ہاں چھپتا۔ ہم اور آپ درسی کتابوں میں ان کا کلام مع سن پیدائش یاد کیا کرتے اور کئی لوگ ان کی شاعری پر ریسرچ کر کے ڈاکٹر بن چکے ہوتے۔

فنکار کو اس کی زندگی میں زندہ درگور رکھنا اور مرنے کے بعد اس کی قبر پر رات دن ہنڈے جلانا ہمارا سماجی دستور ہے۔ مگر منشی جی کے ساتھ سماج نے کچھ زیادہ ہی بے رحمی برتی وہ زندگی بھر مصائب جھیل کر مشقِ سخن کرتے رہے۔ اور آج ان کی قبر کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے۔ خدا جنت نصیب کرے مرحوم ابن انشار کو کہ انھوں نے اپنے چند مضامین میں سرسری طور پر ہی سہی مگر ان کا حوالہ دے دیا۔

www.taemeernews.com


ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل منشی جی کا نادر و نایاب دیوان حال ہی میں منشی جی کے لائق شاگرد ماسٹر انور صاحب انورؔ کے ذریعہ ہم تک بالکل صحیح حالت میں پہنچا ہے۔ چنانچہ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ماسٹر صاحب کے گھر میں ایک دو بلّیاں ضرور موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم حیران ہیں کہ دنیائے شعر و ادب نے اس مجموعے کو اب تک نظر انداز کر کے آخر کیا حاصل کیا ہے منشی جی شاہ نصیر، ذوقؔ دہلوی اور داغؔ دہلوی کے سلسلہ کے شاعر تھے۔ چنانچہ ان کے ہاں سنگلاخ زمینیں بھی ہیں فلسفیانہ لہجہ بھی اور زبان کی شوخیاں بھی۔ کہیں تصویر سے آگے بڑھ جا شمشیر سے آگے بڑھ جا، شراب در تہِ آب شباب در تہ آب، کباب میں سانپ حساب میں سانپ، ساغر ہمہ تن گوش۔ پتھر ہمہ تن گوش آرام پس پشت الزام پس پشت اور بیاباں دو چار مسلماں دو چار جیسی سنگلاخ زمینیں ہیں تو کہیں فانوس، منحوس، ابر صبر اور افلاک ادراک جیسے مشکل قوافی ہیں۔ کہیں ——

وہ نہیں میں کہ جو حوروں سے بہل جاؤں گا
جستجو میں تری جنت سے نکل جاؤں گا

اور

صبر سجدوں سے جی نہیں بھرتا
اس جبینِ نیاز نے مارا

جیسے خوبصورت اشعار ہیں۔ کہیں

دامِ بلا ہیں یار کے گیسو　　فرق نہیں ہے بال برابر

جیسی شوخیاں ہیں تو کہیں

بھاگوں تو جب ہو طاقتِ رفتار پاؤں میں　　زنجیرِ زندگی ہے گراں بار پاؤں میں

جیسی فلسفیانہ باتیں ہیں۔

لیکن ہم بات کر رہے تھے دو تخلص رکھنے کی۔ یہ بھید کیسے کھلا اور منشی جی نے کن کن صنعتوں میں زورِ سخن دکھایا اس کا احوال ملاحظہ کیجئے۔

www.taemeernews.com



# صنعتی شاعری

مرزا غالب نے اپنے دو تخلص استعمال کیے ہیں ۔ اسد اور غالب ہم نے میاں عبدالقدوس سے جو بڑے زبردست پیمانے کے غالب پرست ہیں ۔ پوچھا ۔ کیوں صاحب اس میں کیا حکمت تھی ؟ بولے — مرزا اتنے بڑے شاعر تھے کہ صرف ایک تخلص ان کی شاعری کا وزن نہیں اٹھا سکتا تھا !

لیکن دیوان صبر و عصر پڑھ کر معلوم ہوا کہ دراصل مرزا بھی صنائع بدائع کی شاعری کا قصد رکھتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے ایک تخلص تو ایسا رکھا جس میں نہ اوپر کوئی نقطہ ہے نہ نیچے اور نہ ہی زبان سے اس کی ادائیگی پر ہونٹ ملتے ہیں — جب کہ دوسرے تخلص میں نقطے بھی ہیں اور لب پر ہونٹ بھی مل جاتے ہیں یہی حکمت منشی شنا احمد کے تخلصوں میں تھی ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غالب صنعتوں کی شاعری میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکے ۔ جب کہ منشی جی کا توسن قلم اس میدان میں خوب قلانچیں بھرتا پھرا ۔

یوں تو منشی جی نے تقریباً ہر صنعت میں ایک دو غزلیں ضرور کہیں ، لیکن صنعت رقطاء میں جو غضب انھوں نے ڈھایا اس کی مثال نہیں ملتی ۔ اس صنعت میں ایک حرف بے نقطہ اور دوسرا نقطہ دار ہوتا ہے اور یہ ایسی مشکل صنعت ہے کہ عروض کی کتابوں میں بھی اس کی مثال میں ایک ہی شعر ملتا ہے ۔ اس کا بھی دوسرا مصرعہ کہتے ہیں کہ غلط ہے منشی جی کا کارنامہ یہ کہ اس میں انھوں نے ایک دو نہیں پورے سات اشعار کی غزل کہی ہے جس کا مطلع بہت صاف اور برجستہ ہے ۔

میری ہی طرح پر یہ تعب ہے عتاب ہے
آخر یہ بات کیوں ہے مجھی سے حجاب ہے

اب کچھ اور صنعتیں دیکھیے ۔ غیر منقوطہ یعنی وہ صنعت جس میں مصرعے کا کوئی لفظ نقطہ دار نہ ہو ۔ مثلاً

ڈر رہا اللہ کا اعمال کا کردار کا　　　وسوسہ ہر دم رہا دل کو مآل کار کا

www.taemeernews.com



فوق النقاط جس میں کسی لفظ میں نقطۂ زیریں نہ آئے

دل ہمارا ہر طرح عاشق ہوا دلدار کا　　ناز کا انداز کا رفتار کا گفتار کا

تحت النقاط۔ جس میں کسی لفظ کے اوپر نقطہ نہ آئے۔

جور پر مائل اگر دلبر ہوا　　سب وہ مجھ پر یا مرے دل پر ہوا

واسع الشفتین جس میں ہونٹ نہیں ملتے۔

عشق سی شئے اور کرے حاصل یہ انساں خاک کا
دیکھئے کیا ہے جگر اس کے دلِ صد چاک کا

واصل الشفتین جس میں ہر لفظ پر ہونٹ ملتے ہیں۔

ربِّ اکبر تمہیں انعام مروّت بخشے　　بانٹئے مہر و محبت کبھی احباب میں بھی

مفرد الحرفین۔ جس میں ہر حرف جدا ہو۔

آرزوئے روح اے دل دار آ　　ردک درد و آہ و زاری اب ذرا

واصل الحرفین۔ جس میں پورا مصرعہ مسلسل تحریر میں آسکے۔

خلقت نے مجھے عتیق سمجھا　　تم نے نہ کبھی شفیق سمجھا

ذوالسان۔ جو اردو کے سوا دوسری زبان میں بھی سمجھا جائے۔

قیامت اے نگاہِ یار کردی　　کہ ہر ہستی جگر افگار کردی

اسی طرح اور بھی صنعتیں ہیں۔ مثلاً صنعتِ موصّل، جس میں کوئی حرف مفرد نہ ہو۔ خیفا جس میں ایک لفظ نقطہ دار اور دوسرا بے نقط ہو۔ منقوطہ جس میں ہر حرف نقطہ دار ہو باستثنائے عطف و اضافت جس میں قافیہ مذکر اور ردیف مونث ہو جیسے مستانہ آتی ہے، پیمانہ آتی ہے یا برعکس ہو جیسے صورت آتا ہے، قسمت آتا ہے۔

لیکن ایک بڑی پر لطف صنعت ہے جس کا نام ہی سن کر مزا آجاتا ہے۔ استخراج قافیۂ جدید از اندرونِ قافیہ۔ یعنی وہ صنعت جس میں قافیہ میں سے نیا قافیہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے معنیٰ بدل جاتے ہیں۔ یہ بھی صنعت رقطار کی طرح ایک ایسی مشکل صنعت ہے کہ شعر کہنے والے کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے اس میں منشی جی نے بڑے مزے کے شعر نکالے ہیں۔

منزل ہے دور رو نہ دل زار زار زار
ہمت نہ دیکھ عشق میں زنہار ہار ہار

www.taemeernews.com



روتا ہوں یادِ زلف میں جب میں سیاہ بخت
کرتی ہے دامن اپنا شبِ تار تار تار
محشر میں پھر ملے گی یہی زندگی مجھے
کیونکر اٹھاؤں گا یہ گرانبار بار بار
کالی بلا ہے گیسوئے شب رنگ کا خیال
اس سانپ کو تو اے دلِ بیمار مار مار
ہنستا ہوں دل ہی دل میں میں اے صبر کیا کہوں
کہتا ہے مجھ کو وہ بت عیّار یار یار

ایک اور غزل کا یہ شعر دیکھئے

اِک دن گیا جو دیر سے کعبے میں برہمن
بولا پہن کے جامۂ احرام رام رام

(نوٹ : پہلے مصرعے میں دیر کو تاخیر کے معنی میں نہ پڑھیں)

صنعت ذو بحرین میں بھی (جس میں ہر مصرعہ دو بحروں میں پڑھا جا سکے) منشی جی نے ایک غزل کہی ہے۔

ساتھ اشکوں کے مرا دل بھی مگر آ ہی گیا
میری آنکھوں میں لہو بن کے جگر آ ہی گیا
جستجو والے وہ کیا ہے جو یہاں ملتا نہیں
ڈھونڈنے نکلے تھے ہم تیرا بھی گھر آ ہی گیا

مگر آہ ! اب یہ فنی قلابازیوں والی صنائع و بدائع کی شاعری قصۂ پارینہ بن چکی ہے بقول میاں عبدالقدس کے تُف ہے آج کے شاعروں پر جو اس صنعتی دَور میں بھی صنعتی شاعری نہیں کر سکتے۔

www.taemeernews.com



# فضائلِ عینک

عینک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ رفتہ رفتہ یہ آپ کی شخصیت کا ہی ایک حصّہ بلکہ جزوِ بدن بنجاتی ہے۔ لوگ آپ کو عینک کے ساتھ دیکھنے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے عینک کے بغیر آپ کا تصوّر بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ نے خود بھی دیکھا ہوگا کہ معنک BE SPECTACLED حضرات جب عینک صاف کرنے کے لئے اسے ناک سے اتارتے ہیں تو کچھ دیر کے لئے ان کی شخصیت یکسر تبدیل ہو جاتی ہے وہ کوئی اور معلوم ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ عینک کی اس خوبی سے آپ کئی فائدے اور چاہیں تو کئی نقصان بھی اٹھا سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنے بچپن کے دوست سردار انور کا ایک قصہ یاد آتا ہے۔ جو سگریٹ فیکٹری میں ملازم ہیں۔ ان کا پورا نام تو سردار انور قریشی ہے مگر کئی لوگ روانی میں انھیں سردار انور سنگھ کہہ جاتے ہیں۔ بلکہ آپریشن بلیو اسٹار اور بلیک تھنڈر کے دنوں میں تو سی آئی ڈی والے بھی ان کے نام سے دھوکہ کھا کر ان کے گھر کے چکّر لگاتے رہے۔

انور میاں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ رقم کے اُدھار لین دین کا بے حد شوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اکثر کچھ لوگوں سے رقم اُدھار لے کر ضرورت مندوں کو ناقابلِ واپسی کی شرط پر مستعار دیتے رہتے ہیں مگر ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عینک لگاتے ہیں۔ اس عینک کی ہی وجہ سے انھیں کئی لوگ انٹلیکچوئل بھی سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمارے ہی جیسے ہیں۔

خیر! قصہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک صاحب سے انھوں نے اچھی خاصی رقم قرض لے کر کسی اور کو مستعار دے دی۔ رقم کا مقررہ وقت پر سفر واپسی عمل میں نہ آیا تو اوّل الذکر ان سے تقاضہ کرنے لگا۔ اور یہ موخر الذکر کو تسلّی دینے لگے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، سہولت سے دے دینا بلکہ اور بھی کچھ درکار ہو تو بے جھجک کہہ ڈالیے۔ میں کسی اور سے لا دوں گا۔ ادھر اوّل الذکر

www.taemeernews.com



سے وہ یہ وعدہ کرتے رہے کہ بس فکر نہ کرو اگلے ہفتے ساری رقم گھر پہنچ جائے گی، مگر وہ ہفتہ نہ آنا تھا نہ آیا۔ قرض خواہ کے تقاضے بڑھتے رہے۔ اور آخر نوبت یہاں تک آ گئی کہ انور میاں نے ان راستوں سے بھی گزرنا بند کر دیا جہاں اس کے ملنے کا ذرّہ برابر بھی امکان تھا۔ چنانچہ آدھا شہر ان پر تنگ ہو گیا اور وہ بھی راستے بدل بدل کر جانے لگے۔ مگر ایک دن کیا ہوا کہ وہ شخص گھر کے قریب ہی ایک گلی میں بالکل سامنے سے آتا دکھائی دے گیا۔ گلی تنگ تھی۔ جائے مفر کوئی نہ تھی اور ہو نا قرض خواہ سامنے سے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ یہ فلم "طوفان میل" جیسا سین تھا۔

جب قرض خواہ بالکل سامنے آ گیا، تب اچانک انور میاں کو ایک ترکیب سُوجھی اور اُنھوں نے جھٹ اپنی عینک اتار کر جیب میں رکھ لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرض خواہ انھیں پہچان نہیں پایا اور بولا۔

کیوں جناب یہ سگریٹ فیکٹری میں کام کرنے والے سردار جی کہاں ملیں گے۔"

جواب میں انور میاں نے تھوڑی سی آواز بدلی اور مغلِ اعظم کے لہجہ میں بولے

"وہ آتنک وادی ہے۔ پولیس اسے ایس، ایس، اے، ایم پکڑ کر لے گئی ہے۔ مابدولت جاننا چاہتے ہیں کہ تمہیں اس سے کیا کام ہے۔"

یہ سُنتے ہی قرض خواہ "جی کچھ نہیں ــــ جی کچھ نہیں ــــ" کہتا ہوا وہاں سے بھاگ لیا اور ایسا بھاگا کہ پھر کبھی پلٹ کر نہ آیا۔

یہ تو تھی فائدے کی بات۔ اب نقصان کی بات سُنیے۔

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ انور میاں کی عینک دفتر ہی میں کہیں گم ہو گئی۔ بات دراصل یہ تھی کہ جس طرح ہوائی جہاز میں سونے کے لئے لوگ کانوں میں روئی لگا لیتے ہیں، اسی طرح دفتر میں سونے کے لئے انور میاں عینک اُتار لیا کرتے تھے۔ اس سے دو فائدے تھے۔ ایک تو انھیں کچھ نہ دکھائی دینے کی وجہ سے نیند آ جاتی تھی۔ دوسرے، دیکھنے والے یہ سمجھتے تھے کہ وہ بیدار ہیں اور کسی گمبھیر مسئلے پر سوچ وچار کر رہے ہیں۔

اس روز بھی انھوں نے ایسا ہی کیا۔ مگر جب وہ نیند سے جاگے تو عینک میز سے غائب تھی ــــ کسی نے شرارت کے لئے جان بوجھ کر عینک غائب کر دی تھی یا کچھ اور چکر تھا، کوئی نہیں جانتا۔ بہرحال نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دفتر کے دو آدمی انھیں گھر تک چھوڑنے گئے۔ راستے میں کچھ لوگوں نے اُنھیں نابینا سمجھ کر انھیں سڑک پار کرانے کی بھی کوشش کی مگر انھوں نے "ہشت" کہہ کر انھیں بھگا دیا۔ آخر خدا خدا کر کے گھر پہنچے۔ مگر جیسے ہی دروازہ میں داخل ہوئے، گھر کی تمام عورتیں "ہائے اللہ" اور "دادی اللہ"

www.taemeernews.com



کہتی ہوئی چھتوں پر بھاگ گئیں۔ صرف ان کی بیگم نیچے رہ گئیں مگر وہ بھی پہچان نہیں پائیں اور زور زور سے آیا بچاؤ گھر میں کوئی مرد وا گھس آیا ہے۔" کہتی ہوئی اس کمرے سے اس کمرے میں دوڑتے لگیں اب یہ لاکھ کہتے رہے کہ "بھئی میں ہوں۔ بھئی میں ہوں۔" مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

تب چیخ و پکار سنکر انور میاں کی والدہ گھر میں آئیں اور انھوں نے اپنے لخت جگر کو پہچان کر متعدد اقسام کی قسمیں کھاتے ہوئے بہو کو سمجھایا کہ "پگلی یہ تیرا میاں ہے اور اس کی عینک کہیں کھو گئی ہے۔ تب کہیں جا کر بیگم کو یقین آیا اور گھر کی بڑی بوڑھیوں نے سروں سے دوپٹے اتارے تاہم بیگم تب تک پردہ کئے رہیں جب تک ایک ہفتہ بعد گل محمد چشمہ فروش کے یہاں سے نئی عینک بن کر نہیں آ گئی۔ عینک آئی تو انور میاں کی بھی جان میں جان آئی۔ ورنہ وہ بے چارے تو یہ سوچ سوچ کر ہی پریشان ہوئے جا رہے تھے کہ اپنی اکلوتی اور غیر مطلقہ بیوی کو واپس پانے کے لئے اُس سے اس مہنگائی کے دور میں کہیں عقد ثانی نہ کرنا پڑ جائے۔

www.taemeernews.com



# ہم انٹلکچوئل کیسے بنے ؟

قارئین کرام! ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اب ہمارا شمار انٹلکچوئل لوگوں میں ہونے لگا ہے۔ لہذا آئندہ جو صاحب بھی ہم سے خط و کتابت کرنا چاہیں وہ پروٹوکول کا پورا پورا خیال رکھیں۔ (مشتہر وار)۔

اس ضروری اعلان کے بعد آپ پوچھنا چاہیں گے کہ یہ انقلاب اچانک کیسے آگیا ___ ؟ ابھی تو ہمارا شمار ادیبوں میں بھی نہیں ہوا، پھر راتوں رات انٹلکچوئل کیسے بن گئے؟ تو جناب دونوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے ___ عینک۔ اجی ہاں، خدا کے فضل اور گل محمد صاحب کے فیض سے ہم معینک ہو گئے ہیں اور عینک لگانے لگے ہیں۔

عینک کا انٹلکچوئل ہونے سے کیا تعلق ہے ؟ یہ جاننے کے لئے ملاحظہ کریں ہمارے گزشتہ سال شائع ہونے والے مضامین "عینک کے فائدے" اور "عینک کے مزید فائدے"۔ جن میں ہم نے عینک کے فوائد تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے عینک کا سب سے بڑا فائدہ یہ بتایا تھا کہ اسے لگانے سے آدمی پڑھا لکھا معلوم ہونے لگتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ ذکر بھی کیا تھا کہ عینک لگانے کے ہم کس قدر مشتاق تھے۔ یہاں تک کہ ایک روز گل محمد صاحب کی دوکان پر جا پہنچے اور ان سے عرض کی کہ جناب ہر چند کہ ہماری نگاہ ذرا بھی کمزور نہیں تاہم اگر آپ کوئی نمبر والی عینک بنا دیں تو ہو سکتا ہے لوگ ہماری بھی عزت کرنے لگیں، مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ اور ہزار منت کرنے پر بھی یہی کہتے رہے کہ جھوٹی عینک کبھی نہیں بناؤں گا۔ اس روز پہلی بار ہماری سمجھ میں آیا کہ "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" کا کیا مطلب ہے!

لیکن ہم بھی دُھن کے پکے تھے، اس روز سے ہم نے نگاہ کو خراب کرنے کی کوششیں دوگنی کر دیں۔ رات میں ہی نہیں، دن میں بھی آسمان کے تارے گننے لگے۔ چھت پر بیٹھ کر چاند کی روشنی میں

www.taemeernews.com



ابنِ صفی کے تمام ناول پڑھ ڈالے۔ یہاں تک کہ گرلز انٹر کالج کے گیٹ کے چکر بھی بڑھا دیئے۔
یہ کوششیں رنگ لائیں۔ اور ایک صبح جو ہم سو کر اُٹھے تو نگاہ اتنی دھندلائی ہوئی تھی کہ بڑی دیر تک انگریزی کے اخبار کو دائیں سے بائیں اور اُردو کے اخبار کو بائیں سے دائیں پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ کافی کوشش کے بعد" اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو ہماری نظر کمزور ہو گئی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی ہم کے مارے بستر سے اُچھل پڑے اور سیدھے آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب۔ ملے تو ٹارچ کی تیز روشنی آنکھوں میں ڈال کر ہماری پتلیوں کا بغور معائنہ کیا، جس سے رہی سہی مائی بھی جاتی رہی۔ پھر سامنے دیوار پر ٹنگے حروف کے بورڈ کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"سب سے نیچے والی لائن پڑھو۔"

ہم نے کہا۔ کیسی لائن۔؟

وہ بولے۔ "وہ..... جو بورڈ پر لکھی ہے!"

ہم نے پوچھا" کون سا بورڈ۔؟"

وہ بولے۔ "وہ جو دیوار پر ٹنگا ہے!"

ہم نے پوچھا" کون سی دیوار۔؟"

اس پر ڈاکٹر صاحب جھنجھلا گئے اور بولے۔ "تمہاری نگاہ کمپیوٹر سے ٹیسٹ ہو گی ــــ! تیس روپے فیس کے نکالو۔"

ہم نے ان کی میز پر اپنی جیب خالی کر دی اور ہدایت کے مطابق ایک ٹیلی ویژن نما مشین کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ اُنھوں نے ہمیں مشین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کو کہا اور خود بھی مشین کی دوسری جانب بنی ہوئی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ جیسے ہی ہم نے مشین کی آنکھوں میں دیکھا خوف سے ہماری چیخ نکل گئی۔ مشین کے اندر سے دو بڑی بڑی خوفناک آنکھیں ہمیں گھور رہی تھیں۔
ڈاکٹر صاحب نے کہا" گھبراؤ نہیں! یہ میری آنکھیں ہیں۔"

ہم نے کہا۔" اگر یہ بات ہے تو پلیز آپ اِدھر آ جائیے۔ ہم آپ کی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔"

"چپ رہو! اور خاموشی سے مشین کی آنکھوں میں دیکھتے رہو۔" اُنھوں نے ڈانٹتے ہوئے کہا ــــ اور ہم ڈانٹ کھانے کے بعد آیتہ الکرسی پڑھتے ہوئے مشین کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔

www.taemeernews.com



کچھ دیر بعد مشین میں کچھ کھٹ پٹ ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے ہمیں مشین سے ہٹ جانے کی اجازت دے دی۔

مشین سے کاغذ کا پُرزہ برآمد ہوا، جسے غور سے پڑھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اعلان کیا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تمہاری نزدیک کی ایکسس ۱۶۱ ڈگری اور دُور کی ۹، اور ۰۰ ڈگری ہے۔ جس پر نزدیک کا نمبر اعشاریہ پانچ زیرو پلس اور دُور کا اعشاریہ دو پانچ پلس ہے۔"

ہم خاک بھی نہ سمجھے، ان سے درخواست کی کہ جناب ہم مسلمان آدمی ہیں لہٰذا سب کچھ جوڑ کے بتائیے کہ آنکھ کتنی کمزور ہے۔

ڈاکٹر صاحب ہمیں حیرت سے دیکھنے لگے۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں کسی دماغی ٹانک کی بھی ضرورت ہے۔ یہ پرچی لو اور بازار سے دوا خرید لینا۔"

"پرچی کے لئے شکریہ ڈاکٹر صاحب ــــ بس اتنا اور بتا دیجئے کہ عینک بنوائیں یا نہ بنوائیں۔"

"اگر آنکھیں اور زیادہ خراب نہیں کرنی ہے تو عینک ضرور بنوانی پڑے گی۔"

یہ مژدۂ جانفزا سنتے ہی ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اور ہم گل محمد چشمہ فروش کی طرف چل دیے۔

# چشمے کی دوکان

گل محمد چشمہ فروش کی دوکان پر پہنچے تو وہ بڑی بڑی آنکھوں سے ہمیں گھورنے لگے۔

ہم نے کہا۔ "آداب!"

وہ رکھائی سے بولے ــــ "وعلیکم آداب، کیا بات ہے۔"

ہم نے کہا۔ "عینک بنوانی ہے!"

کہنے لگے۔ "آپ کی عینک نہیں بنے گی۔"

ہم نے پوچھا۔ "کیوں نہیں بنے گی؟"

www.taemeernews.com



بولے۔"اس لئے کہ آپ جھوٹی عینک بنوانا چاہتے ہیں۔ لوگوں پر رعب جھاڑنے کے لئے۔ اور یہ ہماری دوکان کے اُصولوں کے خلاف ہے۔ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مگر گل محمد اپنے اصولوں سے نہیں ہٹے گا۔"

ہم نے کہا۔"لیکن جناب ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ہمارے لئے عینک بنوانا ضروری ہے۔ ہماری آنکھوں کی سماعت سچ مچ بگڑ گئی ہے۔ یقین نہ ہو تو ڈاکٹر کی پرچی دیکھ لیجئے۔"

اُنھوں نے پرچی لے کر اس کا بغور مطالعہ کیا۔ پھر اسے کرنسی نوٹ کی طرح اُلٹ پلٹ کر اچھی طرح دیکھا اور جب پُوری طرح یقین ہو گیا کہ پرچی جعلی نہیں ہے تو گھورتی ہوئی آنکھوں سے مُسکرا کر ہاتھ ہلایا اور بولے۔

"یہ بات ہے تو پہلے کیوں نہیں کہا۔ آیئے اندر آیئے۔ آپ کی ہی دوکان ہے۔ لیجئے پہلے فریم پسند کیجئے ــــ!" یہ کہہ کر اُنھوں نے کئی درجن چشمے ہمارے آگے رکھ دیئے۔

ہم ایک ایک کر کے چشمہ لگاتے رہے اور آئینے میں خود کو دیکھتے رہے لیکن ہر چشمے میں ایک سا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔

ہم نے شکایت کی۔"جناب یہ تو سارے چشمے خراب ہیں۔ ان میں تو بالکل صاف دُھندلا دکھائی دے رہا ہے۔"

وہ گھورتی ہُوئی آنکھوں کے ساتھ ہنسنے لگے۔"آپ بھی خوب آدمی ہیں۔ ارے صاحب یہ تو خالی فریم ہیں۔ ان میں لینس تھوڑا ہی لگا ہُوا ہے۔ آپ کو بس فریم پسند کرنا ہے۔ جو فریم آپ پسند کریں گے ہم اسی میں لینس لگا دیں گے۔"

"کمال ہے، آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔" اس مرتبہ ہم نے ان کی غلطی پکڑ لی۔"جناب جب تک آپ فریم میں لینس نہیں لگائیں گے تب تک ہمیں صاف کیسے نظر آئے گا اور جب تک صاف نہیں نظر آئے گا تب تک ہم آئینے میں فریم کو کیسے دیکھ سکیں گے۔ اور جب تک فریم کو دیکھیں گے نہیں تب تک اسے پسند کیسے کریں گے۔؟"

یہ سُنکر وہ مُسکرانے لگے۔ مگر اُن کی آنکھیں اب بھی گھور رہی تھیں۔ بولے۔

"بات تو آپ کی معقول ہے۔ چلیئے پہلے آپ کے لینس لگا دیتے ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے ایک فریم میں لینس لگا دیئے جس کی مدد سے ہم نے اسی فریم کو پسند کر لیا جس میں انھوں نے لینس لگائے تھے۔

www.taemeernews.com


"لیجیئے اس فریم کی عینک بنا دیجیئے۔" ہم نے فریم اُتار کر انھیں دیتے ہوئے کہا۔
اُنھوں نے ہمیں گھور کر دیکھا اور بولے
"ٹھیک ہے، کل صبح آکر لے لیجیئے!"
"کوئی بات نہیں۔ لیکن عینک ایسی بنایئے گا کہ اس میں ذرّہ برابر عیب نہ ہو۔" ہم نے کہا۔
"اجی بے فکر رہیئے جناب! ایسی عینک بناؤں گا کہ آپ کو اچھے بُرے کی تمیز اور اپنے پرائے کی پہچان ہو جائے گی ــــ انشاءاللہ!" وہ گھورتے ہوئے بولے۔
ہم بے فکر ہو کے چلنے لگے، مگر تبھی کچھ سوچ کر رُک گئے۔
"ایک بات بنایئے جناب۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گے!"
"اجی توبہ کیجیئے ــــ آپ کی بات کا کیا بُرا مانوں گا۔"
"یہ بتایئے ــــ کہ آخر آپ ہمیں اس طرح گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں۔" ہم نے پُوچھا
"گھور کر ــــ نہیں تو ــــ!" وہ سٹپٹائے ــــ" مگر گھورنا اب بھی جاری تھا پھر اچانک ان کے مُنھ سے ایک قہقہہ برآمد ہوا، اور انگلی سے اپنی عینک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔
"یہ سب اس کی وجہ سے ہے!"
ہم نے دیکھا ان کی عینک موٹے شیشوں کی تھی۔

www.taemeernews.com



# ایک آنچ کی کسر

بڑے بڑے شہروں کی تہذیب سے ہمیں ایک ہی شکوہ ہے اور وہ یہ کہ اس نے عوام کو نئی سہولتیں تو دی ہیں لیکن کئی اچھی روایتوں کو ختم بھی کر دیا ہے۔ ایسی ہی روایتوں میں سے ایک ہے کیمیا گری۔ دلّی، بمبئی جیسے بڑے شہروں میں یہ فن عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہے تاہم چھوٹے شہروں میں یہ زندہ تھا۔ مگر افسوس ـــــ اب یہ فن چھوٹے شہروں میں بھی ناپید ہو چکا ہے۔ حکومت تمام گھریلو دستکاریوں اور چھوٹے کام دھندوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے تو نت نئی اسکیمیں شروع کر رہی ہے لیکن کیمیا گری کے احیا کی طرف اس کا دھیان ابھی تک نہیں گیا ہے۔ مگر یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہمارا موضوع ہے کیمیا گری کا زمانہ!

آہ! کیا زمانہ تھا وہ بھی، جب لوگوں کو ہر وقت دال روٹی کی بجائے سونا چاندی بنانے کی فکر رہا کرتی تھی۔ اُجڑے ہُوئے تباہ حال شرفاء کی نشست گاہوں میں ہی نہیں چائے خانوں میں بھی کیمیا گروں کی محفلیں جمتی تھیں۔ طب یُونانی میں دست گاہ رکھنے والے حضرات بھی اپنے مریضوں میں کم اور کیمیا بنانے کے قدیم اور پُراسرار اور سربستہ راز نسخوں میں زیادہ دلچسپی لیا کرتے تھے۔ حکیم جالینوس اور بطلیموس کے نسخوں میں عرق النسا اور شقیقہ کا علاج ڈھونڈنے کی بجائے تانبے اور سیسے کے کُشتے تیار کر کے ان میں سونے اور چاندی کا وزن پیدا کرنے کی ترکیبیں ڈھونڈا کرتے تھے۔ جدھر دیکھئے وہاں پارے کو قائم کرنے سے متعلق تجربات و نظریات پر بحث ہو رہی ہے۔ جنگلوں میں جوگوشی ترسپلا اور سفید گھی کوار ڈھونڈا جا رہا ہے یا عقاب کے بچوں کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔

ہم ان معدودے چند خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنھیں کیمیا بنانے میں تو کبھی دلچسپی نہیں رہی لیکن کیمیا گروں کی محفل میں بیٹھنے کا شرف ضرور حاصل ہوا ہے۔ اور یہ شرف بھی ہمیں اپنے مشہور زمانہ اور نادر روزگار دوست میاں الیاس تیاگی کی بدولت حاصل ہُوا جو بریلی

www.taemeernews.com


تک سونا بنانے کی کوششوں میں لگے رہے اور اللہ کی رحمت سے ہر کوشش میں ناکام ہوئے (سنا ہے آج کل ہماچل پردیش میں کوئی ڈیم بنانے کے لیے ٹھیکے پر مٹی اور پتھر کی کھدائی کر رہے ہیں)

بھائی الیاس میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ جب بھی انھیں کوئی نیا شوق ہوتا ہے تو اسے انتہا تک پہنچا دیتے ہیں۔ کیمیا کے بارے میں بھی یہی ہوا (ہماچل پردیش کے عوام کی قسمت میں کیا لکھا ہے یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے) اس فن میں وہ ان منزلوں تک پہنچ گئے جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو وہ خود بھی جلتے جلتے رہ گئے۔ مگر خیر اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے پہلے یہ سن لیجئے کہ انھیں کیمیا گری کا شوق کیوں کر ہوا؟

ہوا یہ کہ ایک دن کسی نے باتوں باتوں میں ذکر کر دیا کہ ایک بڑے ہی پہنچے ہوئے بزرگ شہر میں آئے ہوئے ہیں۔ ان دنوں بھائی الیاس شوقِ تصوف میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ چنانچہ جہاں بھی کسی بزرگ کا پتہ چلتا وہیں پہنچ جاتے اور تب تک بزرگ کا پیچھا نہ چھوڑتے جب تک وہ ان کے "غریب خانے" پر چل کر چند روز قیام کرنے کے لئے راضی نہ ہو جاتے۔ راہ چلتے چلتے بھی اگر کوئی سفید ریش بزرگ نظر آجاتے تو فوراً رک کر ان سے مصافحہ کرکے ہاتھ چوم لیتے اور ان سے اپنے گھر چل کر چند اور خدمت کا موقع دینے کے لئے اصرار کرنے لگتے۔ چنانچہ شہر کے تمام بزرگ ان سے عاجز آگئے تھے اور کئی بزرگوں نے تو ان کے محلے کے پاس سے گزرنا بھی بند کر دیا تھا۔

خیر ۔۔۔! جیسے ہی میاں الیاس نے سنا کہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ شہر میں آئے ہوئے ہیں تو حالاں کہ اس وقت وہ چٹنی کے لئے پودینہ خریدنے بازار جا رہے تھے مگر فوراً پودینہ کی بجائے بزرگ کی تلاش میں نکل گئے۔ اُدھر بزرگ کو بھی نہ جانے کیسے میاں الیاس کے آنے کی بھنک پڑ گئی، چنانچہ وہ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی رفوچکر ہو گئے۔

مگر میاں الیاس بھی کہاں چھوڑنے والے تھے۔ لگ گئے بزرگ کے پیچھے۔ بالآخر محلہ کنگوئیاں رام لیو میں بزرگ کو جا لیا۔ انھیں دیکھتے ہی میاں الیاس قدموں میں گر گئے۔ اور کہنے لگے کہ حضور مجھ حقیر و فقیر پر تقصیر کو بھی کچھ خدمت کرنے کا موقع دیجئے۔ یہ عقیدت اور جذبہ دیکھ کر بزرگ کا دل پسیج گیا۔ اور وہ ان کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئے۔

دونوں جیسے ہی (بزرگ اور پودینہ) لے کر میاں الیاس گھر پہنچے تو پہلے تو گھر والوں نے خوب ڈانٹا کہ اب آئے ہو ایک ہفتہ بعد پودینہ لے کر۔ مگر پھر بزرگ کی نورانی صورت، سرخ آنکھیں اور لمبی سیاہ داڑھی دیکھ کر ڈر گئے۔ اس دن کے بعد پھر کبھی انھوں نے بھائی الیاس

www.taemeernews.com



سے پودینہ نہیں منگوایا۔

بزرگ نے جن کا نام شاید کڑک شاہ تھا بھائی الیاس کو رموزِ تصوف تو ذرا نہ سمجھائے مگر یہ دعویٰ کر کے انھیں کیمیا کی راہ پر ضرور ڈال دیا کہ ان کے شیخ بابا بھڑک شاہ انھیں سونا بنانے کا ایک نادر اور لاجواب نسخہ بتا گئے ہیں۔ اور یہ کہ وہ چلم کی آنچ پر بھی سونا بنا سکتے ہیں۔

یہ سنتے ہی بھائی الیاس اپنے دادا مرحوم کا پرانا خاندانی حقہ لے آئے۔ جس کی نے اور چلم پر سونے اور چاندی کے تار لپٹے ہوئے تھے۔ کڑک شاہ کئی ہفتوں تک وہ حقہ گڑگڑاتے اور انواع و اقسام کے کھانے کھاتے رہے۔

آخر کار جب بزرگ نے دیکھا کہ ان کی انتہائی مرغن خاطر و مدارات سے میاں الیاس کے گھر والے تنگ آ گئے ہیں اور اب اُن سے ڈرنے کی بجائے ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھنے لگے ہیں تو ایک رات انھوں نے بابا بھڑک شاہ کا نسخۂ کیمیا میاں الیاس کو بتا دیا۔ اس رات میاں الیاس کو بڑی اچھی نیند آئی۔ لیکن اگلی صبح سو کر اٹھے تو کڑک شاہ حقہ سمیت غائب تھے۔

تو صاحبو! یوں بابا بھڑک شاہ کا نسخۂ کیمیا، بابا کڑک شاہ کے ذریعہ میاں الیاس تک پہنچ گیا۔ اگرچہ کڑک شاہ ان کے دادا کا قیمتی خاندانی حقہ چاندی کی چلم سمیت لے اڑے تھے تاہم میاں الیاس خوش تھے کہ چلو ایک بزرگ کی خدمت کا کچھ تو صلہ ہاتھ آیا۔

کڑک شاہ نے اس نسخے کے بارے میں کہا تھا کہ اس کے ذریعہ تانبے کو تو کیا لوہے کو بھی سونے میں بدلا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ آنچ صحیح دی جائے۔

نسخہ بابا کڑک شاہ نے خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا تھا اور کچھ یوں تھا۔

"اوّل عقاب کی چونچ اور چیل کے پنجے چار عدد۔ لے کر کوّے کی چربی میں ہلکی آنچ پر تلو اس طرح جو لیس دار سرش تیار ہو اسے ٹھنڈا کر کے گولیاں بنا لو۔ اور یہ گولیاں کسی سفید اور کالی مرغی کو کھلا دو۔ گولی کھلانے کے کوئی ایک ماہ بعد مرغی جو انڈا دے گی اس کی زردی الگ کر لو۔ پھر اس زردی میں سیماب کا کشتہ اور تانبے و پیتل کا برادہ ایک ایک تولہ ملا کر ایک بڑی مٹی کی ہانڈی میں رکھ دو۔ ہانڈی کو کسی شلغم کے کھیت میں، بیچوں بیچ گاڑ کر اور گائے کے گوبرسے تیار شدہ ایک من اپلوں کے بیچ رکھ کر پورے بارہ گھنٹوں تک پکاؤ۔ اس کے بعد ہانڈی کو کھولو گے تو اس میں دو تولہ اصلی سونا پاؤ گے۔ اس پر اصلی سونے کا رنگ لانے کے لیے کسی سنار سے سونے کا پانی چڑھوا لو۔ اس کے بعد بابا کڑک شاہ کے حق میں دعائے خیر کرو، انشاءاللہ کوئی بھی تمہارے بنائے ہوئے سونے کو غلط

www.taemeernews.com


ثابت نہ کر سکے گا۔"

یہ نسخہ لے کر میاں الیاس کافی دیر تک خوشی سے جھومتے رہے اور جب جھومتے جھومتے تھک گئے تو فوراً عقاب کی تلاش میں نکل پڑے۔ بڑی تگ و دو کے بعد ایک عقاب ہاتھ لگا لیکن جب اسے اپنے ہمراز اور ہم نام دوست اور پہنچے ہوئے حکیم مولوی الیاس نشتر مظاہری صبری، عصری دکلامی کو دکھایا تو انھوں نے کہا کہ بھئی یہ تو عقاب نہیں ہے کیوں کہ جیسا حکیم بطلیموس نے حکیم جالینوس کے حوالے سے حکیم افلاطون کی زبانی حکیم ارسطو کا قول نقل کرتے ہوئے اپنی شہرۂ آفاق کتاب حیوانات مصری دچینی حصہ دوئم کی تیسری جلد میں لکھا ہے۔ عقاب کی چونچ آگے اور دُم پیچھے ہوتی ہے، جب کہ یہ جانور جو تم پکڑ کر لائے ہو اس کی دُم چونچ کی طرف اور چونچ دُم کی طرف ہے۔ لہٰذا یہ عقاب ہرگز نہیں ہو سکتا، زیادہ سے زیادہ تم اسے باز کہہ سکتے ہو۔

بمشکل تمام میاں الیاس ایک ایسا عقاب تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کی چونچ، چونچ کی طرف اور دُم دُم کی طرف تھی۔

چیل اور کوّوں کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے اس لئے ان کے پنجے اور چونچ حاصل کرنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے بعد لیس دار سریش اور اس کی گولیاں تیار کرنے کا مرحلہ بھی بہ آسانی طے ہو گیا۔ لیکن سفید اور کالی مُرغی ڈھونڈنے میں کافی پریشانی ہوئی۔

انہوں نے اپنے گھر کے اور پڑوسیوں کے مُرغی خانے دیکھ ڈالے مگر جو مرغی سفید ملتی وہ کالی نہ ہوتی اور جو کالی ہوتی وہ سفید نہ ہوتی۔ ادھر مولوی نشتر بھی مرغیاں دیکھتے پھر رہے تھے۔ کالی سفید مرغی تو انھیں بھی نہ ملی مگر ایک ترکیب ضرور سوجھ گئی۔ انھوں نے ایک سفید مرغا اور کالی مرغی لے کر دونوں کو کابک میں بند کر دیا۔ ایک ماہ بعد مرغی نے کئی انڈے دیئے تو انڈوں سے چوزے نکلوا لئے۔ ترکیب کارگر رہی۔ ان میں سے تین مرغیاں کالی سفید نکل آئیں۔

اس کے بعد ایک برس تک انتظار کیا گیا۔ سریش کی گولیاں کھا کر ایک مرغی نے انڈا دیا تو نسخہ کے مطابق اس کی زردی انڈے میں تمام اجزا کے ساتھ ڈال کر آپلوں سمیت دونوں حضرات اُن دنوں کے سابق اور آج کل کے موجودہ میونسپل کمشنر اکرام بخشی کے کھیت پر پہنچ گئے۔ مگر وہاں پتہ چلا کہ انھوں نے کھیت میں گاجر بو رکھی تھی۔ آخر دونوں نے گاجر کی پودا اکھاڑ کر

www.taemeernews.com


کھیت میں شلغم کے بیج بوئے۔ اور ایک مٹکے ہانڈی اور اُپلوں کا الاؤ روشن کر کے کھیت کی مینڈ پر جا بیٹھے۔

ایک ایک لمحہ مشکل سے کٹ رہا تھا۔ میاں الیاس اور مولوی نشتر باری باری سانس روکے بارہ گھنٹے پورے ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ خدا خدا کر کے وقت پورا ہوا تو دونوں اُپلوں کے ڈھیر کے پاس پہنچے۔ ایک بانس سے اُپلوں کو کریدا۔ اچانک ایک زور کا دھماکہ ہوا اور ہانڈی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر گئی۔

بعد میں دونوں نے پورے تجربہ کا تجزیہ کیا۔ تو معلوم ہوا کہ مولوی نشتر کی جس گھڑی سے بارہ گھنٹوں کا وقت دیکھا گیا تھا وہ تیز چل رہی تھی۔ میاں الیاس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

"افسوس! ایک آنچ کی کسر رہ گئی ورنہ بابا بھڑک شاہ کا نسخہ تو بالکل ٹھیک تھا۔"

www.taemeernews.com



# تیسری آنکھ

تخیل کی لمبی سے لمبی اُڑان بھرنے اور ایک سے ایک نیا نظریہ پیش کرنے میں میاں عبدالقدوس کا کوئی ثانی نہیں کبھی کبھی ایسی دُور کی کوڑی لاتے ہیں کہ سُننے والا بے چارا حیران پریشان جنگل بیابان رہ جاتا ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ عموماً اُن کے تنہا اور واحد سامع ہم ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے عجیب و غریب نظریات کا پہلا شکار بھی ہم ہی بنتے ہیں۔ وہ تو بڑے سکون سے یہ شوشہ چھوڑ جاتے ہیں کہ یہ ہوتا تو کیا ہوتا اور وہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ جب کہ ہم سنجیدگی سے اس اُدھیڑ بن میں لگ جاتے ہیں کہ جو نیا تصور انھوں نے پیش کیا ہے اگر وہ حقیقت بن جاتا تو کیا ہوتا۔ اور خاص طور سے ہم پر اس کے کیا نتائج مرتب ہوتے۔؟

دُم کا وہ قصہ تو آپ پچھلے ماہ پڑھ ہی چکے ہیں جب انھوں نے یہ نظریہ پیش کر کے ہمیں ذہنی خلجان میں مبتلا کر دیا تھا کہ اگر ترقیِ معکوس کے نتیجے میں آدمی کی دُم واپس نکل آئی تو کیا ہوگا۔؟ میاں عبدالقدوس تو یہ شوشہ، بلکہ دُم چھوڑ کر چلے گئے جب کہ ہم کئی روز تک دُم دار خواب دیکھتے رہے۔

ایک دن کہنے لگے۔

"ڈارون کی تھیوری کے مطابق ارتقاء کر کے انسان نے خود کو صرف ذہنی طور پر ہی نہیں بلکہ جسمانی طور بھی اشرف المخلوقات بنا لیا ہے۔"

میاں عبدالقدوس کی اکثر باتیں سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ بھی گزر گئی۔

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی خاں صاحب۔! ذرا آسان لفظوں میں سمجھائیے۔"

ہم نے کہا۔

www.taemeernews.com



"ارے بھئی! میں انسان کی جسمانی ساخت کی بات کر رہا ہوں۔ اتنا متوازن اور متناسب جسم کسی حیوان کا نہیں، جتنا انسان کا ہے۔ ذرا غور کرو۔ ہاتھ ــ کی جگہ ہاتھ ہیں۔ پیر کی جگہ پیر ہیں، سر کی جگہ سر ہے۔ یہ نہیں کہ ہاتھی کی طرح جہاں ناک ہونی چاہیئے وہاں لمبی سونڈ ہے۔ اور اونٹ کی طرح بھی نہیں کہ جہاں سر ہونا چاہیئے وہاں گردن لگی ہوئی ہے۔ انسان کے جسم کا ہر عضو اس کی صحیح جگہ پر لگا ہوا ہے۔ اور وہی کام کرتا ہے جس کے لئے وہ بنایا گیا ہے۔ مثلاً آنکھ صرف دیکھنے کا کام کرتی ہے۔ سننے کا نہیں۔ کان صرف سننے کا کام کرتے ہیں، کھانے کا نہیں۔ جبکہ دوسرے حیوانوں میں یہ نہیں ہوتا۔ ہاتھی کو دیکھ لو۔ ہاتھی کے سینگ کھانے کے اور ہوتے ہیں، دکھانے کے اور۔"

"سینگ نہیں خانصاحب دانت۔"

"بس یہی خراب عادت ہے تمہاری، بیچ میں ٹوکو گے ضرور، ارے بھئی، بندۂ خدا! جنہیں تم لوگ ہاتھی کے دانت سمجھتے ہو وہ دراصل اس کے سینگ ہوتے ہیں۔ تمہارے اس ناچیز نے بذاتِ خود گائے کے سینگ اور ہاتھی کے نام نہاد دانتوں کی ڈرائنگ کو آپس میں ملا کر دیکھا ہے اور تحقیق سے اس بات کو بایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے کہ ہاتھی کے دانت نہیں، سینگ ہوتے ہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ گائے کے سینگ کانوں کے اوپر نکلتے ہیں جب کہ ہاتھی کے سینگ اس کے دانتوں میں ہوتے ہیں۔ لیکن انسان کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ اس کے جسم کا ہر حصہ وہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہیے۔ نہ کوئی حصہ ضرورت سے زیادہ بڑا ہے نہ چھوٹا۔ سب کچھ اپنی جگہ پوری طرح موزوں ہے۔ جانتے ہو یہ کس کا کمال ہے۔؟"

ہم نے سوال پورا ہونے سے پہلے ہی حسب عادت نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ سب ڈارون کی عقل کا نتیجہ ہے۔ نہ وہ نظریۂ ارتقاء ایجاد کرتا، نہ آدمی اتنی ترقی کرتا۔ آج بھی چار ہاتھ پیروں کے بل چلتا اور جنگلوں میں شکار ڈھونڈتا پھرتا ــــ لیکن ایک کمی پھر بھی رہ گئی ہے ــــ بتا سکتے ہو وہ کیا ہے ــــ؟"

ہم نے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو اور پھر ان دونوں سے پورے جسم کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا اور جب جسم کے ہر حصے کو اس کی موجود پایا تو اطمینان کا سانس لے کر بولے۔

"نہیں!"

"وہ تو میں پہلے ہی جانتا ہوں۔ تم جرنلسٹ لوگوں کے پاس دماغ اور معلوماتِ عامّہ

www.taemeernews.com



جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی، خیر۔! برادرِ عزیز جس چیز کی کمی آدمی کے جسم میں ہے، وہ ہے آنکھ!"

"آنکھ ــــ! لیکن خاں صاحب قدرت نے تو آدمی کو ایک نہیں دو دو آنکھیں دی ہیں ــــ یہاں تک کہ کان بھی ایک نہیں، دو دو دیے ہیں۔ جب کہ ایک سے بھی کام چل سکتا تھا۔"

"دو عدد کان تو خیر، اسٹیریو میوزک سُننے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ لیکن آنکھ کا معاملہ اور ہے۔ کمی یہ ہے کہ دونوں ہی آنکھیں آگے کی طرف ہیں جس سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ آدمی اپنے پیچھے کیا ہو رہا ہے یہ قطعی نہیں دیکھ پاتا ــــ اگر ایک آنکھ پیچھے بھی ہوتی تو اس تیسری آنکھ سے کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوتا کہ سڑک حادثے کم ہو جاتے اور موٹر گاڑیوں میں عقبی آئینے نہ لگانے پڑتے۔ یہی نہیں ــــ اس صورت میں آدمی بیک وقت ٹی وی بھی دیکھ لیا کرتا اور اس بیچ ابنِ صفی کا ناول بھی پڑھ لیتا۔"

"بہت خوب! لیکن حضور یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ سر کے پچھلے حصّے میں تو بال ہیں۔ اگر تیسری آنکھ وہاں ہوتی تو کیا بالوں کی وجہ سے ہر وقت ڈھکی نہ رہتی ــــ" ہم نے بہت سوچ کر نکتہ نکالا۔

"تم بھی احمق کے احمق ہی رہو گے ــــ اماں اگر تیسری آنکھ ہوتی تو وہ سر پر ہی کیوں ہوتی ــــ؟ اسے کسی ایسی جگہ ہونا چاہیئے تھا جہاں وہ سب سے زیادہ کارآمد ہوتی۔"

"مثلاً کہاں؟"

"مثلاً یہاں!" انھوں نے انگشت شہادت دکھا کر کہا۔ "اگر اس انگلی کے سرے پر تیسری آنکھ ہوتی تو اس کا سب سے زیادہ فائدہ ہوتا۔ آدمی آگے پیچھے ــــ اوپر، نیچے ــــ دائیں بائیں ــــ جہاں ہاتھ بڑھا کر دیکھ لیا کرتا۔ یہاں تک کہ اسے اپنے کان کا میل بھی نظر آ جاتا۔ کیا سمجھے۔؟"

www.taemeernews.com



# داڑھی نامہ

اگر آپ کبھی داڑھی پر غور کریں اور غور کرنے کے بعد جو نتیجہ برآمد ہو اس پر مزید غور فرمائیں تو ــــ پائیں گے کہ داڑھی دُنیا کی عجیب ترین شے ہے اور آپ کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جائے گا کہ آدمی بڑا ہے یا داڑھی ــــ! جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہم جتنا قدرت کی اس عجیب و غریب تخلیق پر غور کرتے ہیں اُتنی ہی اس کی عظمت ہماری نظروں میں بڑھتی جاتی ہے۔ اور اب تو ہم یہ بھی ماننے لگے ہیں کہ انسان نے اب تک جتنی ترقی کی ہے وہ سب داڑھی کی ہی بدولت ہے۔

داڑھی کا انسانی تہذیب کے ارتقا سے کتنا گہرا تعلق ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ارسطو سے لے کر کارل مارکس تک جتنے بھی عہد ساز مفکر، سائنس داں اور فلسفی اس دنیا میں ہو گزرے ہیں وہ سب کے سب داڑھی والے تھے۔

دورِ حاضر میں بھی داڑھی ہماری تہذیب و ثقافت کے ساتھ بڑی گہرائی سے جُڑی ہے۔ آپ کتنے بھی اچھے فنکار، مصوّر، موسیقار یا شاعر کیوں نہ ہوں اگر داڑھی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اِسکے برعکس چاہے آپ کو برش پکڑنا نہ آتا ہو، چاہے ستار اور سُرود میں تمیز نہ رکھتے ہوں اور چاہے بحرِ رجز اور بحرِ رمل سے قطعی بے بہرہ ہوں، لیکن اگر آپ نے ایک عدد آرٹسٹک داڑھی پال رکھی ہے تو دُنیا آپ کو سلام کرے گی۔ لوگ آپ کو پکاسو کا جانشیں، استاد علاء الدین کا وارث اور میرؔ و غالبؔ کا بدل کہہ کر پکاریں گے۔

داڑھیاں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ ہلکی داڑھی، بھاری داڑھی، چھوٹی داڑھی، لمبی داڑھی، چوڑی داڑھی، پتلی داڑھی، بھوری داڑھی، کالی داڑھی اور سفید داڑھی تو ہوتی ہی ہے۔ ان کے علاوہ نوعی داڑھیاں بھی ہوتی ہیں۔ جیسے فرنچ داڑھی، اور چینی داڑھی۔ بعض داڑھیاں اتنی طویل و عریض ہوتی ہیں کہ کھانا کھاتے وقت صاحبِ داڑھی کو انگلیوں سے ٹٹول کر اپنا مُنھ ڈھونڈنا

www.taemeernews.com


پڑتا ہے۔

اس کے برعکس بعض داڑھیاں اتنی مختصر ہوتی ہیں کہ سمٹ کر نقطہ بن جاتی ہیں۔ اور کہیں زیر لب ڈھونڈنے پر دکھائی دیتی ہیں۔

داڑھی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ کہتے ہیں کہ ماقبل تاریخ کے انسان کی داڑھی بہت لمبی اور گھنی ہوتی تھی۔ اتنی لمبی کہ وہ انسان کم اور داڑھی زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت داڑھی آدمی سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ پھر آہستہ آہستہ آدمی بھی ترقی کرنے لگا۔ اور جب ترقی کرتے کرتے داڑھی کے مرتبے کو پہنچ گیا تو سچ مچ کا انسان کہلانے لگا۔ بس یہیں سے انسان کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

داڑھی کو شروع سے ہی اقتدار، برتری اور رعب و دبدبہ کی علامت مانا گیا ہے ــــ مردانگی کی واضح ترین نشانی بھی یہی ہے۔ اس کے باوجود بیشتر زبانوں میں داڑھی مونث کہلاتی ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر ملکائیں جن میں کلوپطرہ اور رضیہ سلطان شامل ہیں اپنی مردانگی کا مظاہرہ کرنے کے لئے دربار میں نقلی داڑھی لگا کر آتی تھیں۔ اور نقلی داڑھی کے ذریعہ حکومت کرتی تھیں۔

اس زمانہ میں عام محاورہ یہ تھا کہ جس کی داڑھی اس کی بھینس، لیکن آج کل کے لوگ سمجھ دار زیادہ ہو گئے ہیں اس لئے نقلی داڑھی سے ذرا بھی نہیں ڈرتے۔ یہی وجہ ہے کہ حکمران خواتین نے اب نقلی داڑھی کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ اب وہ داڑھی سے نہیں نعروں سے حکومت چلاتی ہیں۔

داڑھی تقدس، بزرگی اور پیری کی بھی علامت ہے۔ چنانچہ اکثر لوگ بزرگ ہوتے ہی داڑھی رکھ لیتے ہیں۔ آج کل نوجوانوں میں شوقِ بزرگی عام ہے چنانچہ وہ بھی داڑھی رکھنے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ داڑھی کے کئی جسمانی فائدے بھی ہیں۔ مثلاً سردیوں میں مفلر کا کام دیتی ہے۔

دہلی میں ہمارے ایک دوست ہیں ان سے ہماری دوستی موسم گرما میں شروع ہوئی تھی، طویل عرصہ بعد موسم سرما میں بھینٹ ہوئی تو ہم انھیں ان کے لمبے قد اور مخصوص لہجے کے باوجود صرف اس وجہ سے نہیں پہچان پائے کہ انھوں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ آخر جب انھوں نے

www.taemeernews.com



خود ہی دہلی پولیس کے خاص انداز سے گھور کر دیکھا۔ صاحب ہیں۔ داڑھی کی شان نزول معلوم کی تو بولے۔

"یار سردی کے دنوں میں صبح ہی صبح کون شیو کرتا پھرے۔ میں تو نومبر کے آتے ہی داڑھی رکھ لیتا ہوں اور پھر اپریل میں گرمی آتے ہی منڈوا دیتا ہوں"۔

آدمی کی شخصیت پر داڑھی کا بڑا زبردست اثر پڑتا ہے۔ مخنچو سا آدمی بھی داڑھی رکھتے ہی وی۔آئی۔پی۔ معلوم ہونے لگتا ہے۔ کئی لوگ داڑھی کے اس وصف کا خوب مالی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ قرض لے کر ادائیگی کا وقت قریب آتے ہی داڑھی منڈوا دیتے ہیں اور جب داڑھی پھر سے تیار ہو جاتی ہے تو کسی اور سے قرض لے لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور وہ اس طرح داڑھی کمائی کھاتے رہتے ہیں۔

www.taemeernews.com



# تکیہ کلام

تکیہ کلام، جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے اس تکیہ کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کلام کیا جاسکے یا جس سے کلام میں مدد ملتی ہو۔

اسپتالوں میں دیکھا گیا ہے کہ کئی مریض جب بور ہو جاتے ہیں تو بستر پر لیٹے لیٹے تکیہ پر کہنی ٹکا کر، یا بیٹھنے کے بعد تکیہ کو زانو پر رکھ کر دوسرے مریضوں سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اسے بھی تکیہ کلام کہتے ہیں لیکن عام طور پر تکیہ کلام سے وہ لفظ مراد لئے جاتے ہیں جو دوران گفتگو بار بار استعمال ہوتے ہیں مگر جن کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ وہ پورے جملے کو مفہوم بخشتے ہیں مگر خود بے مفہوم رہتے ہیں عمارت بنانے والے اس مزدور کی طرح جو دوسروں کے لئے گھر بناتا رہتا ہے مگر خود بے گھر رہ جاتا ہے۔

تکیہ کلام کو ایک کمزوری بھی سمجھا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو اپنی زبان پر مکمل عبور نہیں ہوتا یا جن کے پاس کہنے کو تو بہت کچھ ہوتا ہے مگر لفظ بہت کم ہوتے ہیں۔ تاش کے جوکر کی طرح کسی بھی لفظ کو ضرورت پڑنے پر ہر اس جگہ ترپ کا پتہ بنا لیتے ہیں جہاں ان کا ذہن کسی خاص مفہوم کی ادائیگی کے لئے کوئی موزوں لفظ نہیں ڈھونڈ پاتا۔

لیکن سچ بات یہ ہے کہ دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کا کوئی تکیہ کلام نہ ہو۔ ضروری نہیں یہ لفظ کی ہی صورت میں ہو۔ تکیہ کلام حرکات و سکنات کی شکل میں بھی ہو سکتا۔ بعض لوگ جب گفتگو کرتے ہیں تو ان کا پورا جسم آگے پیچھے یا دائیں بائیں ایک مخصوص فریکوئنسی میں ہلتا رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اگر کوئی کندھے سے پکڑ کر ساکت

www.taemeernews.com



کر دے تو یقینی طور ہکلانا شروع کر دیں گے۔ اسے ماہرین کے زبان میں "قدآدم تکیہ کلام" کہتے ہیں [ اسی طرح آنکھیں جھپکنا' ناک کو بار بار ہاتھ سے پکڑنا' ناک اور ہونٹ کے بیچ انگلی پھرانا' کنپٹی کے پاس سر کھجانا' ہاتھ یا ٹانگ ہلانا بھی ایسی حرکتیں ہیں جو کئی لوگوں میں آپ کو صرف دوران گفتگو نظر آئیں گی لیکن واضح اور نمایاں تکیہ کلام وہی ہوتا ہے جو بولنے میں آتا ہے۔ اسی طرح ہم تکیہ کلاموں کو دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک "جسمانی" اور دوسرے "صوتی"، صوتی تکیہ کلام بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک سوالیہ دوسرے غیر سوالیہ پہلی قسم کا تکیہ کلام بظاہر سوال کی صورت میں ہوتا ہے لیکن دراصل وہ ایک قسم کا پڑاؤ ہوتا ہے۔ جہاں چند ثانیوں کے لیے رک کر متکلم اپنی بات آگے بڑھاتا ہے۔ مثلاً کیا سمجھے جناب؟" "کیا کہتے ہو؟" یا "کیا کہتے ہیں؟ کئی بار ناواقف سامع اس طرح کے تکیہ کلام کو سچ مچ کا سوال سمجھ کر اس کا جواب دینے لگتا ہے۔ ایسے میں صاحب تکیہ کی حالت قابل دید ہوتی ہے۔ یا تو اس کی سٹی پٹی گم ہو جاتی ہے یا پھر وہ اور بھی جوش و خروش سے بولنے لگتا ہے۔

غیر سوالیہ تکیہ کلاموں میں "قسم ہے پروردگار کی" "آپ کے بچّے جیئیں" "خدا آپ کا بھلا کرے!" "جناب عالی کی خیر ہو" "بس جناب پھر کیا تھا" وغیرہ بے حد عام قسم کے تکیے ہیں مگر کچھ بڑے مخصوص اور طبع زاد نوعیت کے بھی ہوتے ہیں جو کہیں اور سننے میں نہیں آتے مثلاً "آپ کے منہ میں"، "یا قسم ہے ڈھولی کھال کی [ ایک صاحب کا تکیہ تھا اس نے کہا اچھا' میں نے کہا ہاں!" "اتنا بڑا تکیہ کلام' جسے تکیہ نہیں بلکہ گاؤ تکیۂ کلام کہنا چاہیے۔ ابھی تک ہمارے سننے میں نہیں آیا ہے اور ہمیں کامل یقین ہے کہ آپ نے بھی نہیں سنا ہوگا۔ اس قدر طویل تکیہ کلام کو وہ صاحب اتنی روانی اور فصاحت سے استعمال کرتے تھے کہ سننے والا منہ دیکھتا رہ جاتے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس دوران تکیہ کلام کو الٹتے پلٹتے بھی رہتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

"ارے صاحب کیا بتاؤں۔ آج تو میں بال بال بچ گیا۔ گھر کی طرف جا رہا تھا کہ سڑک پر ایک پاگل بیل سامنے آگیا۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا وہ بھی میری طرف آنے لگا میں اور آگے بڑھا تو اس نے کہا اچھا میں نے کہا ہاں۔ اور فوراً ایک پیڑ پر چڑھ گیا مگر صاحب

www.taemeernews.com


بیل نے پیٹر کے تنے میں اتنے زور کی ٹکر ماری کہ میری توپ سیخ ہی نکل گئی پھر اس نے ایک اور ٹکر ماری تو میں نے کہا اچھا اس نے کہا ہاں، اور تیسری ٹکر اس زور سے ماری کہ پیٹر کے دو ٹکڑے ہو گئے اور جو میں شاخ سے گرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیل کے اوپر چڑھ گیا ہوں بس صاحب پھر کیا تھا۔ اس نے کہا اچھا میں نے کہا ہاں اور بیل نے ایسی چھلانگ لگائی کہ میں اس کی پیٹھ سے اچھل کر دوسری سڑک پر جاتے ہوئے ایک خالی رکشہ میں جا گرا۔ رکشہ والا مجھے دیکھتے ہی گھبرا گیا میں نے کہا بھئی گھبراؤ نہیں مجھے ذرا گھنٹہ گھر لے چلو۔ اس نے کہا اچھا میں نے کہا ہاں۔ مگر صاحب وہ تو رکشہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ادھر بیل بھی ابھی پیچھے پڑا تھا۔ مجھے رکشہ میں دیکھتے ہی اس نے کہا اچھا میں نے کہا ہاں اور کسی طرح رکشہ کو خود ہی چلا کر بھاگ پڑا مگر راستے میں وہ برا حال ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ لوگوں نے رکشہ والا سمجھ کر روک لیا اور کئی سواریاں ڈھونی پڑیں تب جا کر دو گھنٹے بعد گھنٹہ گھر پہونچ سکا!"

تکیۂ کلام عموماً مستقل نوعیت کا ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ زبان سے چپکا رہتا ہے۔ مگر کچھ سیزنل بھی ہوتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ سہارنپور میں ہمارے ایک دوست ہیں الیاس صاحب۔ فقیر منش آدمی ہیں اس لئے اپنا تخلص "تیاگی" رکھ چھوڑا ہے ایسا ذات نما تخلص ہم نے ابھی تک کہیں اور نہیں سنا ہے۔ الیاس تیاگی صاحب کی شخصیت کا اچھا پہلو تو یہ ہے کہ انہوں نے تخلص رکھنے کے باوجود شاعری کبھی نہیں کی۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ اپنا تکیہ کلام بدلتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کا کوئی ایک تکیہ کلام نہیں بلکہ پورا بستر کلام ہے۔ وہ بڑے سلیقے سے ایک تکیہ کلام منتخب کرتے ہیں پھر اسے اتنے ہی سلیقہ سے استعمال کرتے ہیں اور جیسے ہی وہ فیشن بن کر دوسروں کی زبان پر چڑھ جاتا ہے جھٹ دوسرا تکیہ کلام گھڑ لیتے ہیں اس طرح وہ شعر نہیں تکیہ کلام کہتے ہیں اور اتنا کہتے ہیں کہ سہارنپور میں کچھ دوست ان کے تکیہ ہائے کلام کا مجموعہ شائع کرانے پر غور کر رہے ہیں۔

"بس ختم ہے۔" ان کا ایک ایسا ہی معرکتہ الآرا تکیۂ کلام ہے جو ریلیز ہوتے ہی ایسا ہٹ ہوا کہ بعض محلوں میں ڈائمنڈ اور پلاٹینم جوبلی منانے کے بعد بھی چل رہا ہے۔ یہ تکیۂ کلام وہ کسی بھی چیز کی حد سے زیادہ تعریف یا برائی کرنے کے لئے استعمال کرتے

www.taemeernews.com


تھے۔ اگر کسی حسینہ کی تعریف کرنا ہوتب بھی "بس ختم ہے" اور کسی تھانیدار کے عیب گنوانے ہوتب بھی صرف "بس ختم ہے" کہہ کر آگے بڑھ جاتے اور تھانیدار دیکھتا رہ جاتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی کام ان کی توقع کے مطابق بڑے سلیقے اور عمدگی سے شروع ہو رہا ہو تب بھی ان کے منہ سے "بس ختم ہے" ہی نکلتا تھا!

"اے شخص" اور "اے شخص بے پناہ" بھی ایسا ہی تکیہ کلام تھا جو وہ ہر ملاقات پر ملنے والے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ملنے والے ایک سے زائد ہوں تو وہ ان سے "اے اشخاص" یا کبھی کبھی زیادہ مؤدب ہوتے تو "اے خشخاش" کہہ کر بھی ملتے تھے ان کی شخصیت سے جڑی ہوئی متعدد دلچسپ داستانیں اگر موقع ملا تو ہم پھر کسی دوسرے مضمون میں بیان کریں گے۔

کچھ تکیہ ہائے کلام بے حد مختصر ہوتے ہیں مثلاً ہائے" جو اہل اردو کے علاوہ اکثر اہل فارسی کی زبانوں پر چڑھی ہوئی ہے۔ موخر الذکر حضرات جب بھی کسی چیز کو ایک سے زیادہ تعداد میں دیکھتے ہیں تو اس کے ساتھ ہائے ضرور لگا دیتے ہیں۔ جیسے "مرد ہائے جواں" "دوشیزہ ہائے رواں" وغیرہ وغیرہ۔ رہی اہل اردو کی بات تو ان بے چاروں کے آگے سے اگر محض ایک دوشیزہ بھی گزر جائے تب بھی ان کے منہ سے ہائے نکل جاتی ہے۔

"یہ"، "وہ"، "آپ"، "تو" جیسے مختصر الفاظ بھی تکیہ کلام بن جاتے ہیں جو بظاہر تو بڑے بے ضرر ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی بڑی الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔

ہمارے ایک عالم فاضل دوست جو عالم کم فاضل زیادہ ہیں۔ اپنی گفتگو میں ہر اسم کے لئے "یہ" استعمال کر کے ہمیں اکثر بہت پریشان کر دیتے ہیں۔ جب بھی وہ ملتے ہیں تو اس قسم کی گفتگو ہوتی ہے۔

ہم: کہئے بھائی عبدالقدوس کیسے مزاج ہیں؟ وہ: ٹھیک ہیں۔ آپ سنائیے۔ بوفورس کی تازہ یہ کیا ہے؟

ہم: یہ؟ یہ کیا؟

وہ: ارے بھئی خبر! تم اخبار والوں سے خبر ہی پوچھیں گے اخروٹ کا یہ تھوڑا ہی پوچھیں

ہم: اخروٹ کا یہ کیا؟

وہ: بھاؤ۔ اور کیا؟ سنا ہے جنرل ضیاء نے جونیجو کو ہٹا دیا ہے۔ اور ۹۰ دن بعد پاکستان میں یہ کرانے کا وعدہ کیا ہے۔

www.taemeernews.com



ہم: یہ کیا؟۔ چناؤ؟

وہ: ہاں چناؤ۔ سنا ہے اس چناؤ میں ضیاء صاحب سیاسی پارٹیوں کو بھی اپنا امیدوار کھڑا کرنے کی یہ دیں گے؟

ہم: یہ؟ یعنی اجازت؟

وہ: ہاں بھئی ہاں۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ دفاعی بجٹ کی وجہ سے پاکستان کی معیشت کا یہ بیٹھ گیا ہے۔"

ہم: یہ کیسا؟

وہ: اوفوہ۔ کمال ہے۔ یہ بھی نہیں سمجھ سکتے بھٹہ بھائی بھٹہ۔ بھٹہ بیٹھنا محاورہ ہے۔ ذرا غور سے بات سنا کرو۔ بار بار یہ کیا یہ کیا کی رٹ کیا لگا رکھی ہے؟ کیا یہ تمہارا تکیہ کلام ہے؟

ہم: یہ؟ نہیں تو!

وہ: پھر یہ کیا ہے؟

ہم: یہ کیا؟

ہمیں مشینوں سے بڑی رغبت رہی ہے۔ سچ پوچھئے تو ہم بچپن ہی سے مشینوں سے کھیلتے آئے ہیں۔ چنانچہ گھر میں گراموفون، ریڈیو، سائیکل اور گھڑی سے لیکر سلائی مشین تک یا مشین نما چیز ایسی نہیں جو ہماری دست برد سے محفوظ رہی ہو اور جس نے اپنا آخری سانس ہماری آغوش میں نہ لیا ہو۔

چند سال پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب کا ریڈیو خراب ہو گیا۔ درجہ پانچ میں ہم ان کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ چنانچہ اس تاریخی تعلق کا فائدہ اٹھانے کے لئے وہ اپنا ریڈیو ٹھیک کرانے ہمارے پاس لے آئے۔ برسوں بعد ان سے ملاقات ہوئی تھی اس لئے ہم نے خوب آؤ بھگت کی تاہم اس بات سے ہم بے خبر ہی تھے کہ حال ہی میں وہ ایک تکیہ کلام بھی اختیار کر چکے تھے۔ خیر۔ انہوں نے اپنا بادا آدم کے زمانے کا جغادری ریڈیو ہماری بیسوی صدی کی ناتواں میز پر رکھا اور دعا سلام کے بعد کہنے لگے۔

"صاحب میں تو آپ سے عاجز آ گیا ہوں عرصہ سے آپ نے بولنا ہی بند کر دیا ہے۔ پہلے ایک آدھ ہاتھ آپ کو رسید کر دیتے تھے تو اپنے آپ کچھ بول پڑتے تھے۔ اب تو کتنا ہی مارتیں آپ پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"جی؟۔ ہمیں؟" ہم وحشت سے چلا اٹھے "ارے صاحب آپ سنئے تو سہی۔ آپ پر

www.taemeernews.com


میں ابتک سینکڑوں روپے خرچ کر چکا ہوں اور آپ ہیں کہ چپ سادھے پڑے ہیں۔
" الہی خیر" اس مرتبہ ہم ہانپتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جہاں تک ہمیں یاد آتا ہے بچپن میں آپ نے ابرا کے پل (سہارنپور کا ایک قدیم پل) پر ایک آنے کا شربت ضرور پلایا تھا۔ جس کی وجہ سے کئی دن تک ہمارا گلا خراب رہا اور والد کی مار پڑی سو الگ۔ اس دن کے ایک آنے کو آپ سینکڑوں روپے کہہ رہے ہیں خدا سے ڈریئے جناب!
" مم۔ مگر میں تو۔۔۔۔" انہوں نے کچھ کہنا چاہا مگر ہمارا غصہ ابھی فرو نہیں ہوا تھا۔
"۔۔۔۔ اور ہاں یہ مارنے کی بات آپ نے کہاں سے نکال لی۔ ماسٹر صاحب کی ایک گھڑکی سے آپ کے کپڑے گیلے ہو جاتے تھے۔ اور آپ ہم پر ہاتھ اٹھانے کی بات کر رہے ہیں؟"
" مم۔ مگر سنئے تو سہی صاحب۔" وہ بولے " میں تو آپ کی بات کر رہا تھا۔ کسی سے بھی پوچھ لیجئے آپ کی وجہ سے میرا دیوالہ نکلا جا رہا ہے۔ آپ یقین کیجئے ابتک میں درجنوں لوگوں کے پاس جا چکا ہوں اور اب تک میرے آپ کے اوپر تقریباً ایک ہزار روپے خرچ ہو چکے ہیں۔"
" آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔" ہمارے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا۔
" قسم ہے پیدا کرنے والے کی میں نے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بولا۔ چاہیں تو میری بیوی سے پوچھ لیجئے۔ اس کے پاس ایک ایک پیسے کا حساب ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اسی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔۔۔"
شرم نہیں آتی آپ کو۔" ہم اتنی زور سے بولے کہ چھت کا پلاسٹر ایک جگہ سے اکھڑ گیا اور گلی میں ایک کتا زور سے بھونکنے لگا۔ " صرف ایک آنہ کے لئے آپ اپنی بیوی کو بیچ میں لا رہے ہیں۔ لعنت ہے آپ پر۔ نکل جائیے میرے گھر سے۔"
وہ سہم کر کھڑے ہو گئے ایک ہاتھ سے ریڈیو اور دوسرے سے اپنی پتلون سنبھالنے لگے۔
" مم معاف کیجئے۔ میں آپ کو۔ نن۔ ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر آپ کو میری بات ناگوار لگی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ کسی اور سے ٹھیک کرا لوں گا آپ کو۔"
وہ ریڈیو پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ آخری جملہ سنتے ہی ایک بجلی سی ہمارے دماغ میں کوند گئی

www.taemeernews.com



اور تب ہم سمجھ پائے کہ "آپ" ان کا تکیہ کلام تھا اور یہ لفظ وہ کبھی ہمارے اور کبھی ریڈیو کے لئے استعمال کر رہے تھے۔

اس کے بعد کافی دیر تک ہم ان سے شرمندہ ہوتے رہے اور وہ ہم سے باتھ روم کا راستہ پوچھتے رہے۔!

# خرّاٹے

کسی نے کہا ہے ـــ اور اگر نہیں کہا ہے تو کہہ دینا چاہئے کہ خرّاٹے صحت کیلئے بہت ضروری ہوتے ہیں۔ جو انسان خرّاٹے نہیں لیتا وہ کبھی صحت مند نہیں ہو سکتا۔ ہم نے آج تک کسی اللہ کے بندے کو، یعنی کسی دبلے پتلے، کمزور، مخنی، ضعیف اور شریف آدمی کو خرّاٹے لیتے نہیں دیکھا تمام نحیف و نزار بندگان خدا اتنی خاموشی سے سوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر فلم بیس سال بعد کے مناظر یاد آجاتے ہیں، جو ہم نے بیس سال پہلے دیکھی تھی اور جو رونگٹے کھڑے کر دینے والے ڈراؤنے مناظر سے بھرپور تھی۔

اس طرح سے دیکھا جائے تو خرّاٹے اور صحت ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہیں۔ آدمی صحت مند تب بنتا ہے جب وہ خرّاٹے لینے لگتا ہے اور خرّاٹے تب لیتا ہے جب اس میں خرّاٹے لینے کا دم ہو۔ یعنی صحت اچھی ہو۔ چنانچہ ہر ایرا غیرا اگر چاہے کہ وہ خرّاٹے لے لیا کرے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ خرّاٹے لینے کیلئے اچھا خاصا دم لگانا پڑتا ہے اور یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے جو انسان خرّاٹے نہیں لیتا وہ ہرگز صحت مند نہیں ہو سکتا لیکن جو شخص خوب صحت مند اور تندرست اور توانا ہونے کے باوجود خرّاٹے نہ لے اسے کیا کہا جائے؟

حکیم عبدالقدوس (جی ہاں، میاں عبدالقدوس حکمت میں بھی ید طولیٰ یعنی لمبا ہاتھ

www.taemeernews.com



رکھتے ہیں) کا کہنا ہے کہ جو انسان صحت مند نظر آتا ہو مگر خراٹے نہ لیتا ہو اس کی صحت بناوٹی، مصنوعی، فرضی اور کھوکھلی ہے۔ اور اس کے اوپر اوپری ہواؤں کا اثر ہے چنانچہ اسے چاہیئے کہ فوراً کسی اچھے حکیم سے رابطہ کرے۔ یہ کہتے وقت وہ موسم سرما و گرما میں اپنے ملنے کے اوقات بھی بتا دیا کرتے ہیں۔

ویسے ہم آج تک یہ نہیں سمجھ پائے ہیں کہ خراٹے کو خراٹا کیوں کہتے ہیں اور یہ کہ خراٹے کی سب سے پہلے کس نے ایجاد کی! جہاں تک ایجاد کا تعلق ہے تو اس بارے میں مختلف ماہرین کے مختلف نظریئے ہیں۔ ایک مکتب فکر یہ مانتا ہے کہ خراٹے قدیم افریقی تہذیب کی دین ہیں جبکہ دوسرے ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ خراٹے وسطی ایشیاء میں پیدا ہوئے جہاں سے آریائی نسل کے لوگ اسے ہندوستان لے آئے۔ اس نظریئے کے حق میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آریہ لوگ بڑے تہذیب یافتہ تھے اور سوائے مویشی چرانے کے کوئی کام نہیں جانتے تھے اس میں بھی چرنے کا کام مویشی خود کر لیا کرتے تھے جبکہ آریہ حضرات آرام سے کسی درخت کے نیچے لیٹے خراٹے لیتے رہتے تھے۔ بس یہیں سے خراٹا ایجاد ہو گیا۔

اس کے برعکس ہندوستان کی قدیم نسلوں کے لوگ اتنے وحشی اور بدتہذیب تھے کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرتے رہتے تھے۔ دیہاتی اور گنوار اس قدر تھے کہ صرف شہروں میں رہنا پسند کرتے تھے اور آدھی سے زیادہ آبادی کھیتی باڑی سے دل بہلانے اور کھیتی کے نئے طور طریقے ایجاد کرنے میں لگی رہتی تھی۔ باقی لوگ بھی ایسے ہی واہیات کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ مثلاً کبھی کسی نے انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ سرخ اینٹ ایجاد کر دی، کسی جدید شہر کا نقشہ بنا دیا، کوئی دو منزلہ مارکیٹ بنانے میں لگ گیا۔ کسی نے تاریخ کا پہلا سیوریج ڈسپوزل سسٹم ایجاد کر دیا۔ اور کسی کو اور کوئی کام نہ ملا تو طرح طرح کے بت، تصویریں اور آلات موسیقی تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ غرض یہ کہ خراٹے لینے کی کسی کو بھی سدھ نہیں تھی۔

وہ تو خدا کے فضل سے آریہ بروقت اس ملک میں آ گئے اور آتے ہی انہوں نے ان وحشیوں بدتہذیبوں اور گنواروں کے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر انہیں جنوبی ہند کے جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ورنہ یہ لوگ تو دادی سندھ اور موہن جوڈارو کو بنگالے اور راس کماری تک پھیلا دیتے۔

www.taemeernews.com



اب رہی خراٹے کو خراٹا کہنے کی بات تو ایسا معلوم ہوتا کہ یہ نام اسے اس کی مناسبت سے دیا گیا ہے۔ اور سوتے وقت ناک اور حلق سے جو خر خر کی آواز نکلتی ہے غالباً اس سے لفظ خراٹا بنایا گیا ہے۔

لیکن سب زبانوں میں اسے خراٹا نہیں کہتے۔ سب لوگ اپنی اپنی مادری زبان میں خراٹے بھرتے ہیں۔ مثلاً انگریز حضرات بڑی نزاکت سے سنورنگ کرتے ہیں۔ عربوں کے خراٹوں میں خ پر غ غالب رہتی ہے لہٰذا وہ اسے غطیط کہتے ہیں جس میں غ خراٹے کی آواز کی اور ط ناک کی علامت ہے جو خراٹا لینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہندوستانی عربی مدرسوں سے فارغ التحصیل حضرات اسے غراطا کہتے ہیں پنجاب والے اپنی زبان کے مزاج کے مطابق کراڑے بھرتے ہیں۔ کرناٹک والے اتنی زور کا خراٹا مارتے ہیں کہ اسے خرخشا کہتے ہیں۔ اور بنگال والوں کی کچھ نہ پوچھیے ان کے ہاں خراٹے کو ناک ڈاکر کہا جاتا ہے یعنی ناک کی ڈکار!

## مزید خراٹے

خراٹے بنیادی طور پر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو صرف سنائی دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو دکھائی بھی دیتے ہیں۔ اول الذکر خراٹوں میں صرف حلق اور ناک کا ہی عمل دخل ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری قسم کے خراٹوں میں آدمی کا پورا جسم انوالو رہتا ہے اور خراٹے کی آمد و رخصت کے مطابق سینہ اور پیٹ کے ساتھ پورا جسم پھولتا پچکتا رہتا ہے۔ چنانچہ ایسا آدمی کسی ڈھیلی ڈھالی چارپائی پر محوِ استراحت ہو تو اس کے ساتھ ساتھ چارپائی بھی خراٹے لینے لگتی ہے۔

بعض لوگ بڑے سریلے خراٹے لیتے ہیں ان کا خراٹا ہلکی سی سیٹی بجاتا ہوا آتا ہے۔ اور سیٹی بجاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ ایسے خراٹوں کو مترنم خراٹا یا سراٹا بھی کہتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے لوگ اتنے زور کے خراٹے بھرتے ہیں کہ آس پاس سونے والوں کا ناک میں دم ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر

www.taemeernews.com


خرّاٹے بھرنے والے دو آدمی ایک کمرے میں اکھٹے ہو جائیں اور دونوں ایک دوسرے کے خرّاٹوں کی شہرت سن چکے ہوں اور شومئی قسمت سے اسی ایک کمرے میں رات گزارنے پر مجبور ہوں تو دونوں کی کوشش یہ ہوگی کہ دوسرے کے سونے سے پہلے خود سو جائیں اس وقت کچھ اس طرح کی گفتگو سنائی دے گی۔

" بھائی خلیل آپ کو ذرا تکلیف تو ہوگی لیکن کیا کروں جب تک کوئی شخص مجھے کچھ دیر تک کتاب پڑھ کر نہ سنا دے مجھے نیند ہی نہیں آتی اس لئے بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ کچھ دیر قصّہ چہار درویش کی یہ کتاب پڑھ کر سنا دیں"

" آپ بھی کیا بات کرتے ہیں جلیل بھائی بھلا اس میں تکلیف کی کیا بات ہے لیکن مجبوری یہ کہ آج میں اپنا قریب کی نظر کا چشمہ مرمت کے لئے دے آیا ہوں۔ پھر میری یہ کمزوری ہے کہ جب تک علامہ اقبال کا شکوہ جواب شکوہ ترنم سے نہ سن لوں ٹھیک طرح سو نہیں پاتا۔ سنا ہے آپ کو پورا یاد ہے اور ترنم بھی ماشاءاللہ بہت اچھا ہے۔"

" ارے بھئی آپ یہ تو آپ کی بندہ نوازی ہے ورنہ بندہ کس قابل ہے لیکن کیا کروں آجکل گلا کچھ خراب چل رہا ہے اس لئے حکم کی تعمیل نہ کر سکوں گا۔ ارے ہاں میں نے سنا ہے آج رات چاند گہن لگے گا چھت پر جا کر دیکھ کیوں نہیں آتے آپ تو علم فلکیات میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔"

" آپ نے ٹھیک سنا ہے لیکن گہن رات چار بجے لگے گا جبکہ ابھی صرف دس بجے ہیں۔ اور ویسے بھی اب میری نظر اتنی اچھی نہیں رہی کہ رات کو آسمان کا مشاہدہ کر سکوں مگر یاد آیا۔ آج رات تو نوگزہ پیر کا عرس ہے اور قوالیاں بھی ہو رہی ہیں۔ آپ تو قوالیوں کا بہت شوق رکھتے ہیں — جائیے سن آئیے کچھ دیر — سنا ہے بڑا اچھا قوال آیا ہے۔"

" ارے صاحب اب وہ پہلے کے شوق کہاں۔ اب تو دنیا کی ہر چیز سے جی بھر گیا ہے مگر کچھ سنا آپ نے چھت پر کسی کے چلنے کی آواز آ رہی ہے میرا خیال ہے کہ بلّی ہے۔ ذرا دیکھئے تو چھت پر جا کر — ہو سکے تو پکڑ کر اگلے محلّے میں چھوڑ آئیے۔"

کیا کہا بلّی۔ نہیں صاحب مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ بڑا ہی عیّار جانور ہے

www.taemeernews.com



کیا پتہ اندھیرے میں پنجہ ہی مار دے۔ میرا خیال ہے آپ چھت پر ہو آیئے۔"
غرض اسی طرح دونوں کوشش کرتے رہیں گے کہ دوسرا اس سے پہلے نہ سونے پائے۔ بالآخر اس بک بک جھک جھک میں آدھی رات ہو جائے گی۔ دونوں تھک کر بستر پر گر پڑیں گے اور ساتھ خرخرانے لگیں گے اور اگر ایک ہی گھر میں کئی لوگ خراٹے لینے والے ہوں تو پورا گھر ایک ایسا ہوائی اڈہ بن جاتا ہے جس پر کئی ہوائی جہاز ٹیک آف کے لئے اسٹارٹ تو ہو گئے ہوں لیکن اڑنے میں نہ آ رہے ہوں

اسی طرح شادی بیاہ کی تقریبوں میں جب الگ الگ کھونٹ کے مہمان ایک ہی جگہ سوتے ہیں اور انواع و اقسام کے خراٹے چھیڑ دیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خراٹوں کا مشاعرہ شروع ہو گیا ہے۔ ایسے ہی ایک مشاعرے میں ہمیں بھی شرکت کا اتفاق ہو چکا ہے جو آغاز میں تو طرحی رہا لیکن کچھ ہی دیر بعد غیر طرحی اور آخر میں بالکل آزاد ہو گیا۔

موقع ایک شادی کا تھا اور باراتی ایک بڑے ہال میں سلائے گئے تھے۔ ہم نے اس ہال میں اپنے تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ قریب سوئے ہوئے ایک صاحب نے زور کی سانس لے کر طرح کا اعلان کر دیا اعلان اتنا زوردار تھا کہ ہم ڈر کے مارے اچھل کر بیٹھ گئے۔

چند لمحے گزرے تھے کہ دور کے کونے سے ایک صاحب اسی طرح میں خراٹہ سرا ہو گئے لیکن مطلع کچھ جاندار نہیں تھا اس لئے کسی طرف سے کوئی ردعمل نہ ہوا۔ اگلا شعر بھی بھی پھسپھسا نکلا چنانچہ کسی نے داد نہ دی۔ یہ دیکھ کر وہ صاحب بھی پھی پھی کی مایوسی بھری آواز کے ساتھ خاموش ہو گئے۔ تبھی درمیان سے ایک صاحب نے پھٹ پھوں کی اور اعلان کر دیا کہ اب وہ اپنا کلام بلاغت نظام پیش کریں گے۔

پہلے تو ان صاحب نے خوں خاں، پھوں پھاں اور ٹھوں ٹھاں کی آوازوں میں چند متفرق اشعار پیش کئے۔ اس کے بعد نہایت میٹھے لہجے میں ترنم کے ساتھ سیٹیوں والی ایک ایسی غزل چھیڑی کہ سامعین میں ہلچل مچ گئی۔ سارا ہال داد سے گونج گیا۔ ہر طرف سے مکرر ارشاد کی صدائیں آنے لگیں اور ہم کانوں میں انگلی دے کر منہ ڈھانپ کر لیٹ گئے۔ اس کے بعد صبح تک یہ مشاعرہ نہایت کامیابی کے

www.taemeernews.com


ساتھ سامعین کی چائے وغیرہ سے تواضع کے بغیر چلتا رہا۔
لیکن اب ہم یہ ذکر بند کرتے ہیں کیونکہ ــــــ رات زیادہ ہوچکی ہے ــــ اور ہمیں بھی ــــ نیند ــــ آنے لگی ــــ ہے ــــ لہذا ــــ خدا حافظ ــــ خر ــــ خر خر ــــ خر ررر

# دوردرشن، اشتہار اور ہم

دوردرشن سے ہم دور دور رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لیکن کیا کیجئے، بیوی ہو یا ٹی وی، کسی سے بھی زیادہ عرصہ دور رہنا ممکن نہیں ہے۔ آج کے معاشرے میں دونوں سے مفر نہیں ہے۔

بیوی جو ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے۔ اور بیوی نہ ہو تو ایسے بھی جینا محال ہے۔ کم و بیش یہی ٹی وی کا معاملہ ہے۔ بیوی نہ ہو تو محلہ والوں کی نظر میں آپ کا کیرکٹر ہر وقت مشکوک بنا رہتا ہے اور ٹی وی نہ ہو تو آپ کا اسٹیٹس مشتبہ ہو جاتا ہے۔

خیر کچھ بھی ہو۔ ٹی وی کے دو فائدے ضرور ہیں اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس پر دوردرشن کی طرف سے روزانہ طرح طرح کے اشتہار دکھائے جاتے ہیں۔ (پہلا فائدہ کیا ہے یہ ابھی معلوم نہیں ہو سکا)

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اشتہاروں کی بھرمار نے دوردرشن کی دلچسپی گھٹا دی ہے مگر ہماری رائے اس کے برعکس ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اشتہاروں سے دوردرشن

www.taemeernews.com


کے پروگراموں کی نہ صرف دلچسپی بڑھ گئی ہے بلکہ اس کی افادیت میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

ذرا حساب لگائیے۔ دوردرشن پر جب بہت کم اشتہار دکھائے جاتے تھے تب کیا حال تھا اور آج کیا حال ہے؟ تب کتنے لوگ ٹی وی دیکھتے تھے آج کتنے دیکھتے ہیں؟ غور کریں گے تو پائیں گے کہ اس زمانے میں جب بجلی بھاگ جایا کرتی تھی تو لوگ شکر مناتے تھے کہ چلو کچھ بھی ہو، بجلی کا بل تو کم آئے گا۔ آج حال یہ ہے کہ کسی واہیات سیریل کے دوران بھی بجلی فیل ہو جائے تو جنتا مارنے پر تل جاتی ہے۔

یہ اشتہاروں کا ہی تو کرشمہ ہے کہ ان دنوں جو لوگ تمباکو کے پان کھا کر دانتوں کا ستیہ ناس کر لیتے تھے وہ آج کل پان پراگ اور میور پان مسالہ سے صحت کا بیڑا غرق کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جو بچے املی اور چاٹ جیسی واہیات چیزوں سے گلا خراب کر لیا کرتے تھے اب وہ رسنا جیسے شاندار سنتھیٹک شربتوں اور کھٹی میٹھی گولیوں سے فائدہ اٹھا کر ڈاکٹروں کی خوشحالی میں اضافہ کر رہے۔ جو عورتیں کم جھاگ دینے والے سستے صابنوں سے کپڑے دھو کر وقت برباد کرتی تھیں آج وہ اپنے ہاتھوں کی نرمی کو نرما جیسے بھرپور جھاگ دینے والے ڈٹرجنٹ پاؤڈر سے برباد کر رہی ہیں۔

کیا یہ سب ترقی دوردرشن کے اشتہاروں کے بغیر ممکن تھی؟

پہلے کے لوگ کوئی بھی اناپ شناپ چیز خرید کر روزہ مرّہ کا کام چلایا کرتے تھے۔ لیکن اب صرف وہی سامان تسکین قلب و روح ہوتا ہے جس کا اشتہار ٹی وی پر آتا ہے۔ جس صابن یا تیل کا اشتہار ٹی وی پر نہ دکھایا جاتا ہو وہ آپ غلطی سے خرید کر گھر میں لے آئیں تو آپ کو نہ صرف بیوی کے بلکہ بچوں کے بھی طعنے سننے کو ملیں گے۔ آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ چور بازار سے گھٹیا چیز خرید لائے ہیں۔

دوردرشن کے اشتہار کی وجہ سے اشیائے صرف کے تئیں لوگوں کا رویّہ اور نظریہ اتنا بدل گیا ہے کہ آپکو کیا بتائیں! خود ہمارا یہ حال ہے کہ جب پہلے سر درد ہوتا تھا تو ایسپرین کی کوئی بھی گولی کھانے سے آرام مل جاتا تھا۔ لیکن اب جب تک

www.taemeernews.com



وکس ایکشن فائیو ہنڈرڈ نہ لیں تب تک دماغ میں الیکٹرانک میوزک بجتا رہتا ہے پہلے گرمیوں میں ہماری پیاس ٹھنڈے اور سادے پانی سے بجھ جاتی تھی اب جب تک کیمپایا تھمس آپ سے منھ کا ذائقہ خراب نہ کرلیں تب تک چین نہیں ملتا پہلے ہم گھر کے پسے مسالے سے بنا قورمہ کھاکر انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے اب جب تک مہاشیاں دسی ہٹی کا بدذائقہ میٹ مسالہ سالن میں نہ پڑا ہو تب تک مزا ہی نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے قورمہ نہیں بینگن کا بھرتہ کھا رہے ہیں۔ پہلے جب بھی برسات آتی تھی تو ہم ہر دوسرے دن آم خرید کر گھر لے جایا کرتے تھے۔ اب جب بھی آم لے جاتے ہیں تو بچے برا سا منھ بناکر مازا کی فرمائش کرتے لگتے ہیں۔ ہم انہیں لاکھ سمجھاتے ہیں کہ بھئی یہ شربت دسہری آم سے نہیں بنتا اور نہ ہی یہ قدرتی آم کے قدرتی ذائقہ کا بدل ہوسکتا ہے، مگر صاحب وہ کہاں مانتے ہیں۔ کہتے ہیں ٹی وی پر بوتل میں آم دکھایا جاتا ہے، اس لئے آپ کی بات غلط ہے۔

لیکن ارباب دور دوشن سے ہمیں ایک شکایت بھی ہے۔ پہلے جب اشتہار دکھائے جاتے تھے تو اشتہاروں کے بیچ کچھ فاصلہ رکھا جاتا تھا۔ تاکہ اشتہار خلط ملط نہ ہوں لیکن اب اشتہاروں کے بیچ ایک سیکنڈ کا بھی وقفہ نہیں ہوتا۔ اس سے بعض ہم جیسے محدود عقل والوں کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے پتہ ہی نہیں چلتا کہ پہلا اشتہار کب ختم ہوا اور کب دوسرا شروع ہوگیا کئی مرتبہ اشتہاریوں سنائی دیتے ہیں۔

کیا آپ کی ناک بند ہے؟

جی ہاں

کیا آپ کو نزلہ ہوگیا ہے؟

ہاں۔

کیا آپ کو کھانسی ہورہی ہے؟

ہاں بھئی ہاں۔

تو پھر سر درد کی گولی کیوں؟

www.taemeernews.com



جب بھی سردی ستائے تو ایک ہی اپائے۔ بندر چھاپ یوریا کھاد۔ ہمیشہ استعمال کیجیئے بندر چھاپ یوریا کھاد یعنی بھرپور پیداوار اور آپ کے کچن کی رونق اسے آپ ہم کھانے میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اس میں تمام ضروری وٹامن موجود ہیں۔ تبھی تو ــــ ممی کھائیں ڈیڈی کھائیں دادا کھائیں دادی کھائیں پیار سے کھائیں شوق سے کھائیں صرف ڈٹرجنٹ پاؤڈر۔

سنو سنو اے بابو جی۔ کپڑے کیوں ہیں میلے دھلے؟

میلے؟ میں نے تو لانڈری میں دھلوائے تھے۔ تبھی تو یہ حال ہے! ہمیشہ یاد رکھئے میلے کپڑوں کا ایک ہی علاج ــــ ہوم لائٹ ماچس! مضبوط لمبی تیلی جلنے میں آسان اور جلانے میں سودھا جنک شادی پر دینے کے لئے سب سے اچھا تحفہ.....

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وقفہ نہ ہونے سے ایک اشتہار کس طرح دوسرے اشتہار سے جڑ جاتا ہے جس سے ہم جیسے لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم کپڑے دھونے کے لئے ٹاٹا نمک اور نہانے کے لئے ڈٹرجنٹ لیکر آچکے ہیں۔ بلکہ ایک دفعہ یہ ہوا کہ دفتر جاتے وقت جب بال سنوار رہے تھے تو سر میں وہ تیل ڈال لیا جسے ہم لمبے گھنے اور چمکدار بالوں کا راز سمجھ کر لے آئے تھے۔ سر میں تیل کو اچھی طرح ملنے کے بعد جب ہم نے آئینہ سامنے رکھا تو بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئے یقین جانیے ہمارے تمام بال سفید ہو چکے تھے۔

کافی دیر تک ہم دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتے رہے اور عین ممکن تھا کہ عین جوانی میں بڑھاپے کا یہ صدمہ نہ جھیل پانے کی وجہ سے خودکشی بھی کر لیتے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ہماری نظر بوتل کے لیبل پر چلی گئی اور بروقت معلوم ہو گیا کہ وہ ہیئر آئل کی نہیں شمپو کی بوتل تھی اور جنہیں ہم سفید بال سمجھ رہے تھے وہ دراصل شمپو کا جھاگ تھا! سفید اور خوشبودار جھاگ جسے دھونے کے لئے اس ہفتے ہمیں دوسری دفعہ نہانا پڑا

www.taemeernews.com


# دایاں بازو بایاں بازو

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی سماجی، اقتصادی اور معاشی حالات و واقعات کا جتنا صحیح تجزیہ کمیونسٹ کرتے ہیں اتنا کوئی اور نہیں کر سکتا خود ہم نے بھی جتنا علم اب تک حاصل کیا ہے وہ سارے کا سارا کمیونسٹوں کی صحبت میں بیٹھنے کا نتیجہ ہے۔ کمیونسٹوں کے ساتھ نہ اٹھتے بیٹھتے تو آج بھی ہم عدیس ابابا کو ملک حبش کا بادشاہ یورژ دازی کو روس کا کوئی پڑوسی ملک، پرتگال کو صدر ڈی گال کا قریبی عزیز، اور سالازار کو روس کے کسی زار کا سالا سمجھتے رہتے۔

اس ضمن میں ہم کامریڈ شمشاد حسین کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہیں گے کہ ان کی ہی بدولت آج ہم بیشتر ادق اور پیچیدہ سیاسی و سماجی اصلاحات اور تاریخی اہمیت کے واقعات سے واقف ہیں۔ ہم نہ صرف یہ جانتے ہیں کہ فسطائیت اور ادرائیت میں کیا فرق ہوتا ہے بلکہ یہ عقدہ بھی حل کر چکے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم پہلی جنگ عظیم کے بعد کیوں ہوئی اور تیسری کب منعقد کی جائے گی۔

جہاں تک اصطلاحات کا تعلق ہے تو ان کا دروازہ ہم پر تب کھلا جب ہمیں کامریڈ شمشاد کی زبانی معلوم ہوا کہ دایاں بازو کیا ہوتا ہے اور بایاں بازو کسے کہتے ہیں۔ بعد میں جیسے جیسے ہمارا علم بڑھا یہ راز منکشف ہوتا گیا کہ نہ صرف تمام اصطلاحیں بلکہ تمام عالمی و ملکی تبدیلیاں بھی ان ہی دونوں بازوؤں کے اردگرد گھومتی ہیں۔

بات کالج کے دنوں کی ہے۔ اس وقت ہمارا خیال تھا کہ جو لوگ اپنے بیشتر کام

www.taemeernews.com


دائیں ہاتھ سے کرتے ہیں وہ دائیں بازو والے ہوتے ہیں۔ اس حساب سے ہم نے خود کو رائٹسٹ (RIGHTIST) ڈکلیئر کر دیا تھا۔ اور محلہ کی مسجد کے امام صاحب کو لیفٹسٹ (LEFTIST) سمجھنے لگے تھے کیوں کہ وہ لکھتے بھی بائیں ہاتھ سے تھے اور بچوں کو بغدادی قاعدہ پڑھاتے وقت قمچی بھی ان کے بائیں ہاتھ میں ہی رہتی تھی۔

چنانچہ جب کامریڈ شمشاد سے پہلی ملاقات ہوئی اور ہم نے انہیں دائیں ہاتھ سے سیخ کباب توڑتے ہوئے دیکھا تو بڑی خوشی ہوئی کہ وہ بھی ہماری طرح رائٹسٹ تھے۔ لیکن جب ہم نے ان سے اپنی خوشی کا اظہار کیا تو وہ اس قدر ناراض ہوئے کہ غصے میں مزید پانچ چھ سیخ کباب اور کھا گئے اور ہمیں ایک کے لئے بھی نہ پوچھا۔

بعد میں سیخوں اور کبابوں سے فارغ ہو کر انہوں نے دائیں اور بائیں بازو پر اس زور کی تقریر کی کہ ہمارے کان جھنجھنا اٹھے۔ اور آنکھیں کھل گئیں۔

کامریڈ نے بتایا کہ دائیں بازو کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو بائیں بازو والوں کے خلاف ہوں اور بائیں بازو کے وہ جو دائیں والوں کے خلاف ہوں۔

"اور جو کسی کے خلاف نہ ہوں۔ وہ؟" ہم نے پوچھا۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ آدمی یا تو کسی کے خلاف ہوگا یا کسی کے حق میں ہوگا۔ بس اسی بات سے پتہ چل جائے گا کہ وہ دائیں بازو کا ہے یا بائیں بازو کا!"

ہم نے مزید وضاحت چاہی تو بولے۔

"دائیں بازو والا وہ ہوتا ہے جس کے خیالات بورژوا ہوں۔ اور بائیں بازو والا وہ جو پرولتاری نظریات رکھتا ہو۔"

"بورژوا اور پرولتاری کیا ہوتا ہے؟"

ہم نے پوچھا

"بورژوا وہ ہے جو رجعت پسند ہو۔ اور پرولتاری وہ جو ترقی پسند ہو۔"

"اوہ! لیکن رجعت پسند اور ترقی پسند میں کیا فرق ہے؟"

"وہی جو قدامت پرستی اور جدیدیت میں ہوتا ہے۔ اور جو انفرادیت اور اجتماعیت میں ہے۔"

"اور ان دونوں میں کیا فرق ہے؟"

"جو دائیں بازو اور بائیں بازو میں ہے۔"

www.taemeernews.com



"اوہ!—— تو یہ بات ہے۔ میں سمجھا کچھ اور بات ہوگی۔ لیکن کامریڈ میرا سوال تو یہ تھا کہ جو نہ دائیں بازو والا ہو نہ بائیں بازو والا اسے آپ کس خانے میں فٹ کریں گے؟"

"وہ بھی کہیں نہ کہیں ضرور فٹ ہو جائے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں بازوؤں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"دائیں بازو میں دو بازو ہوتے ہیں۔ ایک بہت دایاں بازو، دوسرا کم دایاں بازو ان دونوں کو تم دائیں بازو کا رائٹسٹ اور دائیں بازو کا لیفٹسٹ کہہ سکتے ہو۔ اسی طرح بائیں بازو میں ہوتا ہے۔ وہاں بھی بائیں بازو کے رائٹسٹ اور لیفٹسٹ ہوتے ہیں پھر ان کی بھی دو دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے بھی ایک رائٹسٹ اور دوسرا لیفٹسٹ ہوتا ہے جیسے دائیں بازو کا لیفٹ رائٹسٹ اور بائیں بازو کا رائٹ لیفٹسٹ۔ پھر ان کی بھی دو دو قسمیں ہوتی ہیں۔ مثلاً دائیں بازو کا رائٹ لیفٹ رائٹسٹ اور بائیں بازو کا لیفٹ رائٹ لیفٹسٹ۔ چنانچہ جو آدمی سیدھے طور پر دائیں یا بائیں بازو میں نہیں ہے وہ یا تو دائیں بازو کا رائٹسٹ ہوگا یا لیفٹسٹ! یہ بھی نہیں تو بائیں بازو کا رائٹسٹ ہوگا یا لیفٹسٹ یہ بھی نہیں تو....."

بس بس رہنے دیجئے۔ میں سمجھ گیا۔"

اور واقعی، اس روز ہماری سمجھ میں آ گیا بچنے کا راستہ کوئی نہیں ہے۔ کسی نہ کسی خانے میں فٹ ہونا ہی پڑے گا۔ بہت چاہا بہت سوچا کہ نیوٹرل ہو جائیں۔ نیوٹرل رہنے میں ہی زیادہ عافیت ہے۔ مگر افسوس یہ بھی نہ ہو سکا کامریڈ نے بتایا کہ نیوٹرل کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں!

## انتظار اور ابھی

ایک دن ہم نے کامریڈ شمشاد حسین سے پوچھا۔؟

"کیوں چچا انقلاب کب آ رہا ہے؟"

www.taemeernews.com


ہمارا خیال تھا کہ سوال سنتے ہی وہ سوچ میں پڑ جائیں گے۔ مگر ہمارا خیال غلط نکلا۔ انقلاب کا لفظ سنتے ہی ان کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ بڑے جوش کے ساتھ بولے۔

"انقلاب ـــــ بہت جلد آنے والا ہے میرے دوست اس قدر جلد کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ سنو ـــــ غور سے سنو۔ ویت نام میں امریکہ گردن تک دھنس گیا ہے۔ کمبوڈیا میں (جسے آج کل پھر کمبوڈیا کہنے لگے ہیں) لون نول کا تخت پلٹنے والا ہے سوازی لینڈ اور ماریشش آزاد ہو گئے ہیں پرتگال کا سابق ڈکٹیٹر سالازار بستر مرگ پر پڑا ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے یحییٰ خان کو حکومت سونپ دی ہے۔ شام میں حافظ اسد کی حکومت آگئی ہے۔ روس کی چاند گاڑی کسی آدمی کے بغیر چاند پر اتر گئی ہے اور یوگنڈا میں عیدی امین نے ملٹن اوبوٹے کا تخت پلٹ دیا ہے۔ اس لئے اب زیادہ دیر نہیں ہے انقلاب آنے میں۔"

"مگر چچا ـــــ ان معاملوں سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ ہمارے مسئلے تو دوسرے ہیں۔ آلو اور پیاز مہنگے ہو گئے ہیں۔ بھنڈی اور بیگن بازار سے غائب ہیں۔ چینی کی بلیک ہو رہی ہے۔ بے روزگاری بڑھ گئی ہے۔ جگہ جگہ فساد ہو رہے ہیں۔ فرقہ پرستی کا زہر پھیل رہا ہے۔ دفتروں میں کھلے عام رشوت لی جا رہی ہے۔ ہمارا واسطہ ان مسئلوں سے ہے ہمیں سالازار اور عیدی امین سے کیا لینا؟"

"تم ابھی ناسمجھ ہو۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ روزانہ ریڈ بک (لال کتاب) پڑھا کرو چیئرمین ماؤزے تنگ نے اس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ـــــ خیر چھوڑو ـــــ یہ باتیں ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ جن مسئلوں کا تم نے ذکر کیا ہے وہ سب انقلاب کے آتے ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کامریڈ اسٹالن نے کہا تھا کہ ـــــ مگر خیر اسے بھی چھوڑو۔ بنیادی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ غیر ملکی حالات اور واقعات کا مطالعہ بے حد ضروری ہے اس کے بغیر انقلاب کی سمجھ پیدا نہیں ہو سکتی۔"

"لیکن چچا ملک کے حالات کو سمجھنا بھی تو ضروری ہے۔ بلکہ یہ غیر ملکی حالات کو سمجھنے سے زیادہ ضروری ہے۔ جب تک ہم اپنے ملک کے حالات اور اس کے مسئلوں کو نہیں سمجھیں گے تب تک کیسے انقلاب لا سکتے ہیں؟"

www.taemeernews.com


یہ سن کر کامریڈ شمشاد نے ہمیں کچھ دیر تک بڑے غور سے گھورا پھر بولے۔
"معلوم ہوتا ہے تم نے ٹراٹسکی کو نہیں پڑھا ہے"۔
"کیا اسے پڑھنا بہت ضروری ہے؟"
ہم نے گھبرا کر پوچھا
"بالکل۔ اس کے بغیر تم آگے نہیں بڑھ سکتے اور میرا مشورہ ہے کہ ٹراٹسکی کو سمجھنے سے پہلے تمہیں چے گیوارا کا مطالعہ کرنا چاہیئے اس سے سمجھنے میں آسانی رہے گی"
"اوہ!" ہم سوچ میں پڑ گئے "کیا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہو سکتا؟"
"قہہ قہہ قہہ" کامریڈ شمشاد نے زور کا قہقہہ لگایا "انقلاب کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتا مائی ڈیئر! انقلاب کا راستہ بہت لمبا ہوتا ہے"
مگر ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ انقلاب بہت جلد آنے والا ہے"
"ایں؟ ——— میں نے یہ کہا تھا؟ اوہ، ہاں! ٹھیک ہے۔ یاد آیا۔ میں نے یہ ہی کہا تھا انقلاب واقعی بہت جلد آنے والا ہے۔ تم دیکھ لینا ——— بیافرا میں لڑائی بند ہونے والی ہے جیسے ہی لڑائی بند ہو گی یہاں انقلاب آجائے گا"
"لیکن بیافرا کی لڑائی تو بند ہو چکی ہے۔ بیافرا کو علاحدہ کرنے کے لئے لڑنے والے باغیوں نے ۳۰ ماہ کی لڑائی کے بعد ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ آج ہی خبر آئی ہے"
"اچھا؟ ہتھیار بھی ڈال دیئے ہیں۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ ایسا ہونے والا ہے۔ جانتے ہو حال ہی میں رومانیہ کے کامریڈ چاؤسیسکو نے اس بارے میں کیا کہا تھا۔ خیر ——— جانے دو۔ اب وہ سب دہرانے سے کیا فائدہ؟"
"لیکن بیافرا کی لڑائی سے ہندوستان کے انقلاب کا کیا تعلق ہے چچا؟"
"تعلق ہے بھئی۔ ابھی تو کہہ رہا ہوں۔ دیکھو ذرا غور کرنے کی بات ہے۔ اگر بیافرا میں لڑائی بند ہونے پر بیافرا الگ ہو جاتا تو امریکہ اپنا ساتواں بحری بیڑا بحر اوقیانوس سے نکال کر بحر ہند کی طرف لے آتا۔ اس کے بعد روس کا تیسرا بیڑا بحیرۂ روم سے بحر اوقیانوس میں چلا جاتا۔ اس سے امریکہ میں کساد بازاری پھیل جاتی۔ جس کے نتیجے میں ڈالر کی قیمت گر کر آدھی رہ جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ پاؤنڈ اور فرانک ایک دوسرے پر حاوی ہو جاتے اور جاپانی ین ڈالر پر چھا جاتا۔ اس طرح عالمی اقتصادی بحران آجاتا

www.taemeernews.com



افریقہ اور لاطینی امریکہ میں کئی حکومتیں بدل جاتیں اور ہندوستانی سرمایہ دار دیوالیہ ہو جاتے۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا کہ بائیں بازو کے مرکزیت پسندوں کے منصوبے ناکام ہو جاتے اور مرکزیت پسندوں کے بیچ جو انتہا پسند عناصر موجود ہیں وہ بائیں طرف کے بائیں بازو والوں کے ساتھ سمجھوتہ کر کے دائیں بازو کے رجعت پسندوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیتے اور اس طرح ملک انقلاب کے راستے پر گامزن ہو جاتا۔"

"اوہ! یہ بات ہے۔ پھر اب کیا ہوگا کامریڈ؟"

"فکر کرنے کی کوئی بات نہیں دیکھنا صرف یہ ہے کہ امریکی بیڑا کدھر جاتا ہے۔ میرا خیال ہے بیافرا میں لڑائی پھر شروع ہوگی اور اس مرتبہ باغی کامیاب ہو جائیں گے جس کے نتیجہ میں بیافرا الگ ہو جائے گا۔ اور امریکہ اپنا ساتواں بیڑا بحر اوقیانوس سے نکال کر بحر ہند میں لے آئے گا جس کے بعد۔۔۔۔۔۔۔۔"

"بس بس ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔ یہ بتائیے کہ انقلاب کب تک آجائے گا۔"

"میں نے کہا نا ــــــ بہت جلد۔"

"پھر بھی کب تک؟"

"زیادہ سے زیادہ چھ مہینوں میں! اب اس سے زیادہ وقت نہیں لگے گا!" کامریڈ شمشاد نے پاسنگ شو کا نیا پیکٹ کھولتے ہوئے کہا۔

اور یہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔

# ہمیں شکایت ہے

ایسا لگتا ہے کہ شکایت کرنا ہمارا قومی کیریکٹر بن گیا ہے جہاں دیکھئے، جسے دیکھئے کسی نہ کسی کے خلاف شکایت کر رہا ہے۔ دفتر کا چپراسی چھوٹے بابو سے پانی پلانے کا

www.taemeernews.com


گلاس چوری ہونے کی شکایت کر رہا ہے۔ چھوٹا بابو بڑے بابو سے اپنے ٹائپ رائٹر کی خرابیوں کا رونا رو رہا ہے۔ بڑا بابو چیف اکاؤنٹنٹ سے اپنے کنوینس بل کے پاس نہ ہونے پر احتجاج کر رہا ہے۔ چیف اکاؤنٹنٹ بڑے افسر سے رہائش الاؤنس نہ ملنے کا گلہ کر رہا ہے اور بڑا افسر ہیڈ آفس کو لیٹر لکھ رہا ہے کہ مائی ڈیر سر میرے کمرے کا ایئر کنڈیشنر خراب ہو گیا ہے اور کبھی کبھی اتنی ٹھنڈ دینے لگتا ہے کہ کام بند کر دینا پڑتا ہے۔

عام شہری بھی شکائتیں کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اخباروں میں مراسلات والے کالم طرح طرح کی شکایتوں سے بھرے رہتے ہیں۔ کوئی اپنے محلہ میں گندگی پھیلنے کی شکایت کر رہا ہے، کوئی بجلی والوں سے ناراض ہے۔ کوئی لوکل بسوں سے خفا ہے کسی کو پولیس والوں کی بد اخلاقی ناپسند ہے۔ کوئی ٹیلی فون خراب ہونے سے پریشان ہے، کوئی مچھروں مکھیوں جیسے بے یار و مددگار کیڑے مکوڑوں کو کوس رہا ہے۔ کوئی پارکوں میں اسمیک بیچنے پر شور مچا رہا ہے تو کوئی کمپنی باغ میں پھولوں کی کمی سے نالاں ہے اور اعلیٰ حکام سے خار کھائے بیٹھا ہے۔ اور کسی کو یہ شکایت ہے کہ دودھ والا دودھ میں پانی کیوں ملاتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے ——— دودھ والا دودھ میں پانی نہیں ملائے گا تو کیا دودھ ملائے گا۔؟

بعض ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں شکایت کے لئے اور کچھ نہیں ملتا تو سماج میں ذات برادری کی تفریق جیسی فالتو باتوں پر رونے بیٹھ جاتے ہیں کوئی ان سے پوچھے کہ بھئی اگر سید انصاری سے رشتہ نہیں جوڑتا اور پٹھان تیلی سے بات نہیں کرتا تو آپ کو کیا تکلیف ہے۔ آپ اپنا کام دھندہ دیکھئے۔ یہ سب بے کار کی باتیں ہیں ان میں پڑنے سے آپ کو کتنے نفل کا ثواب ہوگا؟۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے صبر و قناعت سے کام لینا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ ذرا سی کوئی پریشانی ہوئی نہیں کہ شکایت شروع کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ سماج میں رہنا ہے تو کچھ پریشانیاں ہوں گی ہی۔ اور پھر اگر مان لیجئے کوئی پریشانی سچ مچ پریشان کن ہے بھی تو کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ شریف لوگوں کی طرح پہلے اس پریشانی کا خود ہی کوئی حل ڈھونڈا جائے اور بعد میں شکایت کی جائے۔

ذرا سوچئے دفتر کے چپراسی کے لئے کیا یہ بہتر نہیں کہ پانی کا گلاس چوری ہونے پر پہلے وہ خود ہی اس چوری کا پتہ لگانے کی کوشش کرے اور جب پتہ نہ چلے تو دوسرے

www.taemeernews.com



چپراسی کا گلاس چوری کرلے ۔ اگر دفتر کے تمام چپراسی ایسا کرنے لگیں تو نہ کسی کو شکایت کرنے کی ضرورت باقی رہے گی اور تمام مسروقہ گلاس بھی بالآخر اپنے اپنے دفتروں میں پہونچ جائیں گے ۔

اسی طرح ٹائپ رائیٹر خراب ہونے پر بھی شکایت کا منفی طریقہ اپنانے کی بجائے تدبیر کا مثبت طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے ۔ آرام سے خراب ٹائپ رائٹر سے کام چلاتے رہیئے اور اپنی میز پر "ٹائپ رائٹر خراب ہے" لکھ کر ایک کاغذ چپکا دیجئے ۔ جب کاغذات میں دفتر کے بڑے افسر مسٹر چھابڑا کا نام مسز چھابڑا ٹائپ ہوگا یا ان کے ہم زلف کا ٹینڈر منظور ہونے کی بجائے نامنظور ہوجائے گا تو وہ خود بھاگے بھاگے آئیں گے اور آپ کا ٹائپ رائٹر بغیر کسی شکایت کے ٹھیک کرادیں گے ۔

دفتر کے دوسرے لوگ بھی اپنے مسئلوں کا ایسا ہی کوئی حل نکال سکتے ہیں ۔ یہاں تک کہ بڑے افسر صاحب بھی ذرا عقل سے کام لیں تو زیادہ سردی پھیلانے والے ایرکنڈیشنڈ کو ٹھیک کرانے کی بجائے دفتر کے خرچ سے ہیٹر خرید کر مسئلے کو حل کرسکتے ہیں ۔ بعد میں جب ایئر کنڈیشنر بالکل خراب ہوجائے گا تو نیا ایئر کنڈیشنر خریدنے کی درخواست دی جاسکتی ہے ۔

جہاں تک عام شہریوں کا سوال ہے تو ان سے ہم قطعی ناامید ہوچکے ہیں اس لئے ہم انہیں کوئی صلاح نہیں دیں گے وہ چاہیں تو شکایت کرکے اپنا وقت برباد کرتے رہیں ۔ ہم اس معاملے میں بولنے والے نہیں ہیں اور ویسے بھی ہماری سنتا کون ہے ؟ ہم نے ایک سے ایک قیمتی مشورہ اس کالم میں دیا ہے مگر کسی نے کان نہیں دھرا ۔ اب ان بھلے آدمیوں سے کوئی پوچھے کہ بھائی اگر محلہ میں گندگی پھیل رہی ہے تو آپ کو کیا آپ اپنا گھر صاف رکھئے ۔ بجلی نہیں تو موم بتی کس مرض کی دوا ہے ؟ مقامی بسوں میں بھیڑ رہتی ہے تو اسکوٹر اور ٹیکسی کس کے لئے ہیں ۔ آپ ہی کے لئے تو یہ چیزیں ایجاد کی گئی ہیں ۔ پولیس والے گالیاں نہیں تو کیا میر و غالب کے شعر سنائیں گے ؟ ٹیلی فون خراب ہے تو بھگتئے ۔ آپ سے کہا کس نے تھا یہ مصیبت مول لینے کو ۔ مچھروں مکھیوں سے ناک میں دم ہے تو مسجد میں جایئے ۔ مندر میں جایئے ۔ خدا سے دعا کیجئے کہ وہ انہیں صراط مستقیم پر آنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ۔ آخر زمین و آسمان پر جو کچھ ہے اسی کی تو تخلیق ہے !

پارکوں میں اسمیک بک رہی ہے تو شور مچانے سے کیا فائدہ ؟ آپ کو یہ چیز بری لگتی ہے

www.taemeernews.com



تو مت خریدیئے دوسروں کو اس نعمت سے محروم کرنے کی کوشش تو نہ کیجئے۔ اب رہ جاتا ہے کمپنی باغ۔ تو حضور اگر اس میں پھول کم ہیں تو آپ کو اس شہر میں روک کس نے رکھا ہے؟ کرا لیجئے تبادلہ کسی اچھے کمپنی باغ والے شہر میں۔

یاد رکھئے ـــــ شکایت کمزوری اور احساس کمتری کی نشانی ہے۔ جو قومیں شکایت کرتی ہیں وہ کبھی ترقی نہیں کرتیں۔ اس انگریز شہزادی کا حکیمانہ قول یاد کیجئے جس نے محل کے سامنے بھوکے ننگوں کا ہجوم دیکھ کر ملکہ سے حیران ہو کر پوچھا تھا "ممی انہیں روٹی نہیں ملتی تو یہ کیک کھا کر گزارہ کیوں نہیں کرتے؟"

ہمارے کان یہ سننے کو اور آنکھیں پڑھنے کو ترس گئیں کہ صاحب ہم جس حال میں ہیں خوش ہیں۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔ جہاں جاتے ہیں کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی کی شکایت کرتا مل جاتا ہے جو بھی اخبار پڑھتے ہیں وہ شکائتی مراسلوں سے بھرا ملتا ہے اور ہم سوچنے لگتے ہیں کہ کاش ہماری قوم صبر و قناعت کی اہمیت جانتی۔ کاش اخباروں میں شکایتی مراسلوں کی بجائے تشکرانہ مراسلے شائع ہوا کرتے۔

چنانچہ آج اس کالم میں ہم کچھ تشکرانہ مراسلے بطور نمونہ پیش کر رہے ہیں اس امید میں کہ شاید انہیں پڑھ کر ہی کچھ لوگ راہ راست پر آجائیں۔ شاید یہ کسی قلب کو گرما دیں۔ شاید یہ کسی روح کو تڑپا دیں۔

## مراسلہ نمبر ا بہ عنوان "حکام اعلیٰ توجہ دیں"

مکرمی! ہم اہل دہلی باشندگان اندرون ترکمان دروازہ آپ کے مؤقر اخبار کے ذریعہ متعلقہ حکام سے درخواست گذار ہیں کہ وہ ہمارے علاقہ کے حالات سے پریشان نہ ہوں ہم صبر و قناعت میں یقین رکھتے ہیں۔ لہذا ہر حال میں خوش ہیں خدا کا شکر ہے کہ ہمارے علاقہ میں مسلسل گندگی بڑھتی جا رہی ہے۔ کباڑیوں اور تانگے والوں نے سرکاری زمین پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے جس سے پیدل چلنے والے بہت خوش ہیں کیونکہ ناجائز قبضوں سے سڑک پر چلنے میں ہونے والی ہر پریشانی ان کے لئے موجب تلقین صبر ہے۔ یہ امر بھی باعث مسرت

www.taemeernews.com



ہے کہ برسات کا پانی جگہ جگہ بھرنے سے مچھر۔مکھی بڑی تعداد میں پیدا ہوگئے ہیں۔تشویش بس اس بات کی ہے کہ ابھی تک ہیضہ نہیں پھیلا ہے تاہم حکام پریشان نہ ہوں اگر وہ اس علاقہ میں مچھر مار دوا کا چھڑکاؤ نہ کر کے اسی طرح اہل علاقہ سے تعاون کرتے رہے تو انشاء اللہ کچھ روز بعد ہیضہ نہیں تو ملیریا ضرور پھیل جائے گا۔ امید ہے یہ تعاون جاری رہے گا۔

## مراسلہ نمبر ۲ بہ عنوان "اسمیک کی کھلی فروخت"

مکرمی! ہم اہل علاقہ پھاٹک تیلیان اپنے علاقہ میں اسمیک کی کھلی فروخت سے بے حد خوش ہیں۔کیونکہ اس سے ہمارے نوجوانوں کو اپنا اخلاق وغیرہ تباہ کرنے میں بے حد مدد مل رہی ہے۔ہم مقامی پولیس چوکی انچارج کے خاص طور پر شکر گذار ہیں کہ وہ اسمیک کی فروخت کو فروغ دینے میں پورا تعاون کر رہے ہیں۔ان کی اور ان کے تھانہ انچارج کی سرپرستی میں اسمیک کی کھلی فروخت کا ایک مربوط نظام تشکیل پا چکا ہے۔معزز حضرات کی پشت پناہی سے اسمیک فروخت کرنے والے منافع کی آدھی رقم پولیس چوکی پہونچا دیتے ہیں۔اگر کوئی مرد د شکایت کرتا ہے تو معزز لوگ پولیس کی بھی پشت پناہی کر دیتے ہیں۔ہم لیفٹننٹ گورنر اور پولیس کمشنر سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ چوکی انچارج اور تھانہ دار کو ان کی بہترین کارکردگی اور اعلیٰ فرض شناسی کے لئے انعام واکرام سے نوازا جائے اور اگر اسمیک کا کاروبار مکمل طور پر پولیس کو سونپ دیا جائے تو کیا کہنے! ہم گورنر صاحب کے بے حد مشکور ہوں گے۔

## مراسلہ نمبر ۳ بہ عنوان "اردو بازار کی کایا پلٹ"

مکرمی! ہم اہل علاقہ جامع مسجد آپ کے اخبار کے ذریعہ دہلی انتظامیہ کی توجہ اردو بازار کے شاندار ارتقاء کی طرف دلانا چاہتے ہیں۔یہ تاریخی بازار جسے غالبؔ، ذوقؔ، داغؔ حالیؔ۔اور جوشؔ جیسے پیغمبران ادب کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہے آج انڈے مرغی اور مچھلی کی بدبو سے مہک رہا ہے۔

www.taemeernews.com


آزادی کے بعد گذشتہ چالیس برسوں میں اس بازار نے شاندار ترقی کی ہے اور دہلی انتظامیہ کا تعاون شامل حال رہا تو آگے بھی ترقی کرتا رہے گا لاجپت رائے اینڈ سنس کے مالک کتب فروشی کا کام نہایت خلوص و محبت سے انجام دیتے تھے۔ ان کی دکان میں آج کل بھینس کا گوشت فروخت ہو رہا ہے جلد ہی یہاں بکرے کا گوشت بھی ملنے لگے گا تاج کمپنی اور چمن بک ڈپو میں گھڑیوں کی مرمت کے علاوہ ایک دام کے دہلی میں تیار کردہ لکھنوی کرتے بازار سے اونچی قیمتوں پر بک رہے ہیں۔ مکتبہ "برہان" میں مرغیاں اور انڈے فروخت ہو رہے ہیں۔

(نوٹ: مرغیوں میں مرغے بھی شامل ہیں) ڈپٹی نذیر احمد کے کتب خانہ میں تیل، کنگھے اور برتن بیچے جا رہے ہیں۔ حالی پبلشنگ ہاؤس میں مچھلی فرائی ہو رہی ہے۔

سنگم کتاب گھر میں جوتوں کی دکان کھل گئی ہے۔ غرض اردو بازار کی تمام تر تاریخی انفرادیت تاجرانہ اور منافع خوروں کی مساعی جمیلہ و شکیلہ کی بدولت ختم ہوتی جا رہی ہے تاہم کچھ ناعاقبت اندیش احیاء پسند اس انفرادیت کو بحال کرنا چاہتے ہیں۔ ہم لیفٹننٹ گورنر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس طرف قطعی توجہ نہ دیں۔!

امید ہے کہ ان مراسلوں سے اہل نظر کو روشنی ملے گی۔ تاہم یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ ہم شکایتی مراسلوں کے یکسر خلاف ہیں۔ اگر شکایت مثبت ہو تو شکایت بھی کی جانی چاہیئے۔ مثلاً ــــــ "محکمہ ٹیلی فون توجہ دے" کے عنوان سے کھچڑی پور کالونی ــــــ کے ایک صاحب کی یہ شکایت ملاحظہ کریں۔

مکرمی! میں آپ کے اخبار کے ذریعہ محکمہ ٹیلی فون (تیس ہزاری ایکسچینج) کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ آج ۳۵ دن ہو گئے میرا ٹیلی فون جس کا نمبر ڈبل ٹو زیرو نائن فور ٹو فائیو ہے بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے۔ دس مرتبہ شکایت کرانے کے باوجود ٹیلی فون خراب نہیں ہوا۔ تیس ہزاری ایکسچینج میں جا کر بذات خود شکایت درج کرائی تب بھی حکام کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ ایک تو مہانگر ٹیلی فون نے ٹیلی فون کا کرایہ بہت کم رکھا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر دو ماہ کے بل میں صرف دو ماہ کی کالوں کا بل لیا جاتا ہے۔ اگر میرا ٹیلی فون اسی طرح ٹھیک چلتا رہا تو محکمہ کو کافی نقصان ہو جائے گا۔ اب آپ کا اخبار ہی آخری وسیلہ رہ گیا ہے جس کے ذریعہ میں محکمہ ٹیلی فون سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ جلد سے جلد ٹیلی فون میں کوئی خرابی پیدا کرے اگر جلد ہی ایسا نہ ہوا تو راقم الحروف بقلم خود تحریک چلانے پر مجبور ہو جائے گا

www.taemeernews.com


جس کے نتائج کی ساری ذمہ داری حکام پر ہوگی۔

## جواب حاضر ہے

لیجئے صاحب ـــــــ حد ہوگئی!

کل ہم نے کچھ فرضی تشکرانہ مراسلے یوں ہی ذرا قوم کی اصلاح کے لئے اس کالم میں رقم کر دیئے تھے یہ کہتے ہوئے کہ ذرا ذرا سی بات پر شکایت کر کے حکام اعلیٰ کو خواہ مخواہ پریشان نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ جیسے بھی حالات ہیں انہیں صبر سے برداشت کرتے ہوئے حکام کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے تاکہ ان کی حوصلہ شکنی نہ ہو اور وہ عوام کی بہتر سے بہتر خدمت کے لئے ہمہ وقت تیار رہ سکیں وغیرہ وغیرہ۔

عوام پر تو ہم نہیں جانتے کہ ہمارے مراسلوں کا کتنا اثر ہوا لیکن ہمارے حکام کا سچ مچ کوئی جواب نہیں ہے۔ انہوں نے ہمارے تمام فرضی مراسلوں کو سچ سمجھ کر ان کے انتہائی تشفی بخش جواب ارسال فرما دیئے ہیں۔ یہ جواب بھی ہمارے مراسلوں کی طرح فرضی ہیں یا نہیں یہ تو ہم نہیں جانتے تاہم ان سے حکام اعلیٰ کی نیک نیتی کا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہم شہریوں کی پریشانیوں اور دقتوں کا کس قدر خیال رکھتے ہیں۔ ہم حکام اعلیٰ سے اس معذرت کے ساتھ کہ انہیں ہمارے فرضی مراسلوں کو غلطی سے حقیقی سمجھنے کی زحمت اٹھانا پڑی ان کے جوابات ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔ تاکہ انہیں بھی اندازہ ہو سکے کہ حکام اعلا ہمارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔

پہلا مراسلہ باشندگان اندرون ترکمان دروازہ کی طرف سے تھا۔ اس کے جواب میں دہلی انتظامیہ کے چیف سکریٹری کے پرائیویٹ سکریٹری کے پی اے صاحب رقم طراز ہیں۔

مکرمی! آپ کے اخبار میں شائع ہونے والے مراسلہ بہ عنوان "حکام اعلیٰ توجہ نہ دیں" کے جواب میں عرض ہے کہ مراسلہ نگار حضرات نے ہم سے یہ درخواست کر کے کہ ہم ان کے علاقہ کے حالات سے قطعی پریشان نہ ہوں ہمارے سر سے ایک بڑا بوجھ اتار دیا ہے اس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔ گندگی میں مسلسل اضافہ سڑکوں پر کباڑیوں اور تانگے

www.taemeernews.com



والوں کے ناجائز قبضوں اور مچھروں و مکھیوں کی افراط پر جو اظہار تشکر کیا گیا ہے اس کے لئے بھی ہم بے حد ممنون ہیں اہل علاقہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہم نے سال میں صرف ایک مرتبہ مچھر مار دوا چھڑکنے کی اسکیم فوری طور پر معطل کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے جس پر چالیس لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔ جہاں تک علاقہ میں بے حد گندگی کے باوجود ہیضہ نہ پھیلنے کی شکایت کا تعلق ہے تو مجھے یہ خوش خبری دیتے ہوئے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ ہیضے کے ٹیکے لگانے کا کام فوراً بند کیا جارہا ہے اور ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ جلد ہی اہل علاقہ یرقان اور پولیو جیسی خطرناک بیماریوں کے پھیلنے کا مژدہ بھی سنیں گے۔

اس یقین کا سبب ماہرین کی وہ امید افزا رپورٹ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہیضے کے بعض ٹیکے ناقص ہیں اور ان کا الٹا اثر ہونے کے امکانات بے حد روشن ہیں۔

دوسرا مراسلہ بہ عنوان "اسمیک کی کھلی فروخت" اہل علاقہ پھاٹک تیلیان کی طرف سے تھا پولیس کمشنر صاحب کے اردلی نے اس کے جواب میں لکھا ہے۔

مکرمی! اہل علاقہ کی پرزور فرمائش پر متعلقہ چوکی انچارج اور تھانے دار کو اسمیک کی کھلی فروخت کا مربوط نظام تشکیل دینے پر کمشنر صاحب کی طرف سے توصیفی سند معہ دس ہزار روپے نقد بطور انعام دیا جارہا ہے۔ علاوہ ازیں پولیس میڈل کے لئے بھی ان کے ناموں کی شفارش کردی گئی ہے۔ نشہ بندی سمیتی بھی انہیں انعام اور اعزاز دینے کی تجویز رکھتی ہے کمشنر صاحب نے دونوں افسروں کو ترقی دے کر اور انہیں بالترتیب ایس ایچ او اور اے سی پی بنا کر دوسرے علاقوں میں بھیجنے کی بھی پیش کش کی تھی جسے انہوں نے خندہ پیشانی سے یہ کہتے ہوئے مسترد کردیا کہ حضور ہم جس حال میں ہیں خوش ہیں۔ امید ہے عام شہری اس جذبہ کی تعریف کریں گے۔ تاہم جہاں تک اسمیک کا کاروبار مکمل طور پر پولیس کو سونپنے کے مطالبہ کا سوال ہے تو ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ موجودہ قوانین کے تحت ایسا ممکن نہیں۔ پھر بھی کمشنر صاحب نے اس تجویز کو اپنے سفارشی نوٹ کے ساتھ ہوم سکریٹری کے پاس بھیجدیا ہے اہل علاقہ کو جان کر خوشی ہوگی کہ پولیس اب ان کے یہاں اسمیک کی کھلی فروخت سے صرف نوجوانوں کا اخلاق تباہ نہیں ہونے دے گی۔ بلکہ بزرگوں کی طرف بھی پوری توجہ دی جائے گی۔ جلد ہی علاقہ کے بزرگوں کو اسمیک کا عادی بنانے کے لئے پولیس کی طرف سے ایک ایڈکشن کیمپ کھولا جائے گا جس کی کمشنر صاحب نے منظوری دے دی ہے۔

www.taemeernews.com



مراسلہ نمبر۳ بہ عنوان "اردو بازار کی کایا پلٹ" کے جواب میں میونسپل کمشنر صاحب نے یہ خط لکھا ہے۔

مکرمی! اہل علاقہ جامع مسجد کا مراسلہ ہمارے لئے باعث طمانیت و ترغیب ہے۔ اس شاندار تاریخی بازار کو مزید ترقی دینے کے لئے کارپوریشن نے کئی کروڑ روپے کی لاگت سے ایک اسکیم شروع کی ہے جس کے تحت اس سال مزید ۱۰۰ تاجروں کو مچھلیوں خاص طور پر سڑی ہوئی مچھلیوں کا کاروبار بلا لائسنس کرنے کی اجازت دی جائے گی علاوہ ازیں جن دکانوں میں بدقسمتی سے اب بھی اردو کی کتابوں کا کاروباری ہے ان کے مالکوں کو بکرے کا گوشت۔ مرغیاں۔ انڈے اور ایک یا دو دام والے لکھنوی کرتے بیچنے جیسے منافع بخش کام شروع کرنے کی ترغیب دی جائے گی اور ان کاموں کیلئے خصوصی رعایت پر قرضے دلائے جائیں گے۔ میں اہل علاقہ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس بازار کی تاریخی اہمیت و انفرادیت بحال کرنے کی مانگ کرنے والے احیا پسندوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جائے گی۔ ان کی طرف اور بہت سے دیگر معاملوں کی طرف بھی توجہ نہ دینے کے لئے کارپوریشن جلد ہی اپنا عملہ بڑھا رہی ہے۔

# بابری مسجد رام جنم بھومی

پچھلے ہفتے جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے ایڈیٹر موہن چراغی بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ کے بیچ پڑ گئے ہیں اور اہم شخصیتوں سے لے کر عام قاریوں (قارئین) تک اس مسئلہ پر سب کی رائے مع تصویر چھاپ رہے ہیں تو ہم نے ان سے گزارش کی کہ پلیز ہماری بھی رائے چھاپ دیجئے کہ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں مگر انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ تم نہ اہم شخصیتوں میں ہو نہ عام قاریوں میں اس لئے تمہاری رائے نہیں چھپ سکتی۔ ہم نے کہا

www.taemeernews.com

پھر تصویر ہی چھاپ دیجئے کم سے کم عاشق مزاج حضرات کی غلط فہمیاں تو دور ہو جائیں گی تو بولے ہم نیگیٹیو نہیں چھاپ سکتے۔

یہ سن کر ہم نے ایر کنڈیشنڈ دفتر میں آہ سرد بھری اور سڑک پر یہ سوچ کر نکل آئے کہ اپنی نہ سہی اوروں کی ہی رائے لے لیتے ہیں۔ ہمارا کچھ تو کنٹری بیوشن ہو جائے گا اس بحث میں! مگر سڑک پر آکر سوچنے لگے کس کی رائے لی جائے؟ میئر صاحب کی؟ ایل جی صاحب کی؟ یا سی ای سی کی؟ اچانک خیال آیا کہ یہ لوگ تو پڑھے لکھے ہیں۔ کیوں نہ ان لوگوں سے بات کی جائے جو نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں۔

بس اس خیال کا آنا تھا کہ ہم نے ایک آٹو رکشا کیا اور پرانی دہلی کی طرف چل پڑے راستے میں ہم نے آٹو رکشا والے سے پوچھا۔

"کیوں بھائی۔ رام جنم بھومی بابری مسجد تنازعہ پر تمہاری کیا رائے ہے؟"

"ساڈی کی رائے ہو سکدی اے میاں صاحب جی! اسی تو ایتھے ہی کھلوتے رینڈے سن (ہم تو یہیں کھڑے رہتے ہیں) سواری مل گئی تو واہ ——— نہیں تو واہگورو کی جے۔"

"پھر بھی ——— کچھ تو سوچا ہوگا کبھی اس مسئلہ کے بارے میں!"

"ایس وچ سوچن دی کی لوڑ ہے؟ گولی تو چلنی ہی چلنی ہے۔ پاویں (چاہے) شری دربار صاحب ہو پاویں بابری مسجد ہو یا بابری مندر ——— خون تو بہنا ہی بہنا ہے"

آٹو رکشا سے مایوس ہو کر ہم بارہ ٹوٹی اتر گئے۔ وہاں ہر طرف تانگے والوں کا ہجوم دکھائی دیا۔ چنانچہ ہم نے ایک تانگے والے سے کہا۔

"کیوں بھائی بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ پر تمہیں کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں ——— تیلی واڑہ کے آٹھ آنے ہیں۔" اس نے کہا۔

"میں تیلی واڑہ کی نہیں بابری مسجد رام جنم بھومی کی بات کر رہا ہوں۔"

"ادھر نہیں جائیں گے صاحب۔ ہمارا تانگہ صرف تیلی واڑے جاتا ہے۔ گھاس مہنگی ہو گئی ہے۔ چارہ کم ملتا ہے۔ گھوڑا کمزور ہوتا جا رہا ہے۔"

"مگر بھائی ....."

"چلنا ہے تو چلو بابو صاحب نہیں تو خالی پیلی ٹیم برباد مت کرو۔ ہاں بھائی تیلی واڑا ——— تیلی واڑا ——— آٹھ آٹھ آنے سواری ——— آٹھ آٹھ آنے ———"

تانگے والا دوسری طرف منہ کر کے زور زور سے آواز لگانے لگا۔

www.taemeernews.com


ہم نے سوچا، آٹو رکشا اور تانگے والے مصروف لوگ ہیں اس لئے وہ اپنی رائے نہیں دیں گے کسی خالی بیٹھے ہوئے شخص کو تلاش کرنا چاہیئے۔ تلاش کرتے کرتے ہم بلی ماران تک پہونچ گئے مگر کوئی بھی اپنے کام سے خالی نہ ملا۔ آخر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ایک بوڑھا شخص مل گیا جو غالباً نابینا تھا اور بڑے آرام سے بیٹھا چنے کھا رہا تھا۔

"السلام علیکم قبلہ"

"وعلیکم السلام۔ اندھا ہوں بابا۔" بوڑھا چنے کھاتا کھاتا رک گیا۔

"میں اخبار کی طرف سے بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ پر آپ کی رائے لینے آیا ہوں آپ اس مسئلہ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور آپ کی نظر میں اس کا حل کیا ہے؟"

بزرگ نے بایاں ہاتھ بائیں کان پر رکھا زور زور سے کہا ——————

"دے اللہ کے نام پر —— جمعرات کا دن ہے بابا —— جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا"

آواز اتنی کڑک دار تھی کہ ہم سیڑھیوں پر لڑھکتے لڑھکتے رہ گئے۔ تاہم ہم نے کمال ضبط سے کام لیا اور جیب سے ایک روپے کا سکہ نکال کر بڑے میاں کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"بابا —— یہ بڑا سنگین مسئلہ ہے کچھ تو کہیئے۔" ہم نے ان کے کان کے قریب منہ لے جاکر رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر جا —— منڈا آٹھ لگا دے —— مالک مدد کرے گا۔" بزرگوار نے پھر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا چار و ناچار ایک روپے کا ایک اور سکہ ہاتھ پر رکھ کر ہم جامع مسجد کی سیڑھیوں سے اتر آئے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مزار کے پاس پہونچ گئے۔ سوچا لگے ہاتھوں فاتحہ ہی پڑھ لی جائے۔ ابھی ہم فاتحہ پڑھ ہی رہے تھے کہ ایک تہمد پوش نوجوان جس کی مونچھیں تیل سے چمک رہی تھیں وہاں آیا اور دھیرے سے بولا۔

"کیا چاہیئے؟"

"کچھ نہیں۔ لیکن اگر تم بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ پر کچھ کہنا چاہو تو ——"

"موج لینی ہے؟" وہ ہماری بات کاٹ کر بولا "نیا مال آیا ہے بالکل سفید....."

"نہیں"

"وڑا لگائے گا"

www.taemeernews.com



"نہیں میاں جی ۔"

"ابے تو پھر یہاں کیا کر رہا ہے ـــــ چل بھوٹ ۔۔۔۔"

"مگر میاں جی، میں تو بابری ۔۔۔۔۔۔"

"ابے چل یہاں سے ـــــ ابھی نادری جوتا دکھاؤں گا تو بابری وابری سب بھول جائے گا ۔"

قلم کاپی سنبھال کر ہم وہاں سے سیج پرچ بھاگ لئے اور ۲۱۶ نمبر کی بس پکڑ کر لکشمی نارائن مندر جا پہونچے ہمارا خیال تھا کہ مسلمانوں کے علاقہ میں بات نہیں بنی شاید ہندوؤں کے یہاں بن جائے ۔ مندر کے پاس ہی ایک دین دار پنڈت جی چھولے بٹورے کھاتے ہوئے مل گئے ہم نے ان سے مدعا بیان کیا تو بولے ۔"آپ نش پکش وچار (غیر جانب دارانہ رائے) جاننا چاہتے ہیں ؟"

"جی ہاں ۔"

"تو پھر اسے بابری مسجد رام جنم بھومی وواد نہیں رام جنم بھومی بابری مسجد وواد کہیئے ۔"

"بات تو ایک ہی ہے ـــــ چاہے اس طرح کہہ لیجئے چاہے اس طرح ۔"

"ایک بات کہاں ہے شریمان ۔ رام جنم بھومی پہلے آئے گی ۔ اب سنیئے میرا نش پکش وچار ۔۔۔۔"

ظاہر ہے ایسے نش پکش وچار سننا فضول تھا چنانچہ ہم نے مندر کی سیڑھیوں کا رخ کیا اور ایک اڈھیڑ عمر بھگت جوڑے کو روک لیا ۔ ان کی رائے جاننا چاہی تو مرد نے ہاتھ جوڑ کر کہا ۔

"ہمارا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے بھائی جی ـــــ ہم تو یہاں شری کرشن جی مہاراج سے اپنی تین بیٹیوں کے لئے وَر مانگنے آئے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ہاں بیٹے" عورت رندھے ہوئے گلے سے بولی "ہم کیا جانیں مندر مسجد اور اجودھیا کی باتیں ـــــ ہم تو کانپور سے اپنی جوان بیٹیوں کے لئے سکھی جیون کی بھیک لینے آئے ہیں مہاراج سے ۔۔۔۔۔۔"

مایوس ہو کر ہم گھر کی طرف روانہ ہو گئے ۔ جمنا کے پل پر پہونچے تو ہر طرف پانی ہی پانی دکھائی دیا ۔ پشتہ کے اندر جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے بھاگ بھاگ کر اپنا سامان اوپر ـــــ اونچی سڑک کے فٹ پاتھ پر لا رہے تھے ۔ سب کی جھونپڑیوں میں پانی آگیا تھا ایک شخص جو اپنا سارا سامان اوپر لا کر بیوی بچوں کے ساتھ چارپائی پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا ہم

www.taemeernews.com



نے اپنا سوال دہرایا۔ سوال سنتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں مالک۔"

ہم نے اسے تفصیل سے مسئلہ کی نوعیت کے بارے میں بتایا۔ وہ ہاتھ جوڑے ہماری باتیں سنتا رہا۔ اور جب ہم خاموش ہو گئے تو بولا ـــــ "ٹھیک ہے ـــــ سمجھ گیا سرکار ـــــ آپ کو ہی ووٹ دیں گے!"

# اُلٹا چکّر

ایک دن ہم نے اخبار میں چین سے متعلق ایک دلچسپ خبر پڑھنے کے بعد میاں عبید الفردوس سے پوچھا۔ "کیوں خان صاحب۔ کیا یہ سچ ہے کہ پے ای چنگ میں ہر چیز کو چھونے سے بجلی کا ہلکا سا جھٹکا لگتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کا موسم بے حد خشک ہے جس سے ہر چیز میں اسٹیٹک بجلی پیدا ہو جاتی ہے؟"

سوال سن کر خان صاحب حسب عادت پہلے تو ہمیں گھورتے رہے۔ پھر ماتھے پر بل ڈال کر کافی دیر تک سوچنے کے بعد بولے۔

"پے ای چنگ؟ ـــــ یہ کیا بلا ہے؟"

"بلا نہیں خان صاحب شہر ہے۔ چین کا دارالخلافہ جہاں آجکل ہمارے وزیر اعظم دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ اور جسے بیجنگ بھی کہتے ہیں۔"

"اچھا ـــــ بیجنگ۔ وہ جسے پہلے پیکنگ کہتے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"تو یوں کہو نا۔ کیا ہوا اس شہر میں؟" ہم نے سوال دہرایا۔ اس مرتبہ غور کرنے سے پیشانی کے بل اور گہرے ہو گئے جس کی وجہ سے ناک کچھ اونچی ہو گئی اور عینک

www.taemeernews.com



مرتے گرتے بچی پھر خوب غور کرنے کے بعد پیشانی ناک اور عینک کو درست کرتے ہوئے بولے ،، اس میں حیرت کی کیا بات ہے - پرانی دہلی کے بیشتر مکانوں میں ایسا ہوتا ہے - وہاں عام چیزوں میں تو کیا ، در و دیوار تک میں کرنٹ آجاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ واٹر پائپ ناقص ہونے سے مکان سیل جاتے ہیں اور ڈیسو کی فٹنگ خراب ہونے سے ان میں کرنٹ دوڑنے لگتا ہے . کیا سمجھے ؟،،

،، چلئے خیر یہ بتائیے وزیر اعظم ہند کے دورہ چین کی بابت آپ کی کیا رائے ہے ؟"
اس مرتبہ خان صاحب نے نہ غور کیا ، نہ عینک کو سنبھالا - ایسا لگتا تھا کہ وہ جواب کے لئے پہلے سے تیار تھے - کہنے لگے ،، اماں اس بارے میں کچھ نہ ہی پوچھو تو بہتر ہے - آج کل ہر طرف الٹا چکر چل رہا ہے -،،

،، الٹا چکر ؟ کیا مطلب ؟،،

،، مطلب یہ کہ دنیا میں جدھر بھی دیکھو عجیب و غریب واقعات ہو رہے ہیں - ایسی باتیں ہو رہی ہیں کہ سن کر یقین نہیں آتا - پتہ نہیں اس دنیا کا کیا حشر ہونے والا ہے -،،

،، بھئی خان صاحب - للہ صاف صاف بتایئے - ہمارا دل نہ دہلایئے ،،

،، اماں اس میں صاف صاف بتانے کی کیا ضرورت ہے سب کچھ واضح تو ہے ! ادھر دیکھو تو کیا ہو رہا ہے - اس ملک کو کبھی آہنی پردے میں چھپا ہوا ملک کہا جاتا تھا جہاں آزادیٔ اظہار کی بات سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی - وہاں آج کل گلاسنوسٹ اور پیریسترویئکا کی باتیں ہو رہی ہیں - جس چین کو روس امریکی سامراج کا پٹھو قرار دیتا تھا اس سے آج کل اس کی گاڑھی چھن رہی ہے ادھر امریکہ کے بھی طور طریقے بگڑ رہے ہیں - کل تک یاسر عرفات کو وہ دہشت گرد کہتا تھا مگر آج ان کی ہی جماعت سے بات چیت کر رہا ہے - افغانستان کو دیکھ لو - کل تک وہ افغان باغیوں کو لٹیرا کہتے نہیں تھکتا تھا مگر آج ان سے مصالحت کی باتیں کر رہا ہے - اور وہ بھی کہاں سعودی عرب کے شہر طائف میں ! اپنا پڑوسی پاکستان بھی کچھ کم نہیں ہے جس فوج نے بھٹو کو پھانسی پر لٹکایا تھا اس نے بھٹو کی بیٹی کو کرسیٔ اقتدار پر بٹھا دیا ہے - بڑے بڑے مولوی چلاتے پھرے کہ اسلام میں کسی عورت کو سربراہ مملکت نہیں قبول کیا جا سکتا لیکن عوام ایک عورت کو ہی وزیر اعظم چن کر مانے ! دوسرے ملکوں میں بھی انہونی باتیں ہو رہی ہیں - انگولا سے کیوبا کے فوجی واپس جا رہے ہیں کمبوڈیا کے سیاسی حالات نیا موڑ لے رہے ہیں - جنوبی اور شمالی کوریا ایک دوسرے کے

www.taemeernews.com



قریب آتے جارہے ہیں۔ ویت نام اور چین میں تناؤ ختم ہورہا ہے۔ اور عراق و ایران میں تو کچھ نہ پوچھو۔ سن سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے!"

"کیوں ــــ خیر تو ہے کیا ہوا انہیں۔"

"ہونا کیا ہے۔ یاد ہے دونوں پچھلے دس برس سے کس مزے سے جنگ کرتے آرہے تھے آج کل جنگی قیدیوں کا تبادلہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایران جو کچھ کہتا ہے اسے عراق مان لیتا ہے اور عراق جو کچھ کہتا ہے اس کے آگے ایران سر تسلیم خم کردیتا ہے۔ صدام حسین کو ایران والے طاغوتی حکمراں اور خمینی کو عراق والے خونی کٹھ ملا کہتے تھے اور ایک دوسرے کو مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر آج دونوں ایک دوسرے کا جیتا ہوا علاقہ واپس کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ سب یوں ہی چلتا رہا تو کچھ تعجب نہیں کہ آنے والے دنوں میں حالات اور بدل جائیں اور ہمیں اور بھی عبرت انگیز خبریں سننے کو ملیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً ــــ معمر قذافی کا دورہ اسرائیل تل ابیت میں پرتپاک خیر مقدم یا اسحٰق شمیر کی ریاض میں شاہ فہد سے ملاقات۔ یا صدام حسین کی آیت اللہ خمینی سے بیعت بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ گورباچیف امریکہ کے صدارتی چناؤ میں کھڑے ہوجائیں اور جارج بش کو روس کا وزیر خارجہ بنا دیا جائے!"

خان صاحب بے حد سنجیدگی سے بولے۔

یہ آخری بات کچھ زیادہ ہی اونچی ہوگئی ہے خان صاحب"، ہم نے کہا۔ "لیکن مان لیجئے اگر ہر طرف دوستی اور امن کا ماحول بننے لگا ہے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔؟"

"ہرج؟ اماں جانتے ہو اس سب کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟"

"ہوگا یہ کہ ــــ ہر طرف امن و امان ہوجائے گا۔ جھگڑے بند ہوجائیں گے اور لوگ چین کی بنسی بجانے لگیں گے۔ پھر بتاؤ۔ تمہارا اخبار کون خریدے گا؟"

www.taemeernews.com



# سحری

اس رات ہمارے کمرے میں ایک ایک کر کے دو دھماکے ہوئے دونوں کی آواز سے ہم دو مرتبہ بستر پر ایک ایک فٹ اچھل گئے ابھی تیسری مرتبہ اچھلنے کے لئے ایک اور دھماکے کا انتظار کر ہی رہے تھے کہ میاں عبدالقدوس کی آواز سنائی دے گئی اور ہم سمجھ گئے کہ وہ گلی میں کھلنے والے دروازے پر اپنے مخصوص انداز میں دستک دے رہے تھے۔ کمرے کی بتی جلا کر ہم نے جیسے ہی دروازہ کھولا میاں عبد القدوس شروع ہو گئے۔

"ارے بھئی۔ بندۂ خدا کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ کیا آج جمعہ کو بھی روزہ نہیں رکھو گے؟ چلو سحری کا وقت ہو گیا ہے۔ اب اٹھ جاؤ۔"

ہم نے دروازے کی چولوں کا بغور معائنہ کیا اور انہیں صحیح سلامت پا کر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بولے۔

"آپ نے جس انداز سے دستک دی ہے قبلہ اس سے ہم پوری طرح اٹھ گئے ہیں اور اب مزید اٹھنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ رہی خدا کے خوف کی بات تو یقین کیجئے آج ہم روزہ ضرور رکھیں گے۔"

"لیکن میرے عزیز روزہ رکھنے کے لئے سحری کھانا ضروری ہے۔ پہلے وہ کام تو کر لو تبھی تو روزہ رکھو گے۔"

"مگر ابھی تو ایک ہی بجا ہے خاں صاحب سحری کا وقت چار بجکر ۱۹ منٹ تک ہے۔ ابھی ساڑھے تین گھنٹے باقی ہیں۔"

www.taemeernews.com



"تو کیا ہوا؟ تمہیں شاید معلوم نہیں سحری کا وقت کس تیزی سے گزرتا ہے یہ ساڑھے تین گھنٹے تو میرے دوست ایک گھنٹے میں گزر جائیں گے! اس لئے جلدی سے منہ دھو کر میرے ساتھ آؤ سحری کا تمام سامان تیار ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو میں ایک سحری کر بھی چکا ہوں!"

"ایک سحری؟" ہم چونک گئے "تو کیا آپ کئی سحریاں کرتے ہیں؟"

"ہاں بھئی! گرمیوں کے روزے ہیں کوئی مذاق نہیں۔ کبھی ایک سحری کا روزہ رکھو پھر دیکھو کیا حال ہوتا ہے تمہارا۔"

"یوں جوش نہ دلائیے خان صاحب ہم نے بچپن میں پہلا روزہ بغیر سحری کا رکھا تھا۔"

"اماں رہنے دو۔ وہ سب تو روزے دار بچے کے ریکارڈ کا اثر تھا جو تم بچپن میں دن رات گراموفون پر بجایا کرتے تھے۔ اور پھر سحری سے زیادہ تمہیں پہلے روزے کی افطاری کا شوق تھا۔ جس کے لالچ میں تم نے بعد میں بھی کئی پہلے روزے رکھے تھے! مگر خیر! اب تم باتوں میں وقت نہ گنواؤ۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔ میں ذرا اتنے میں کچھ اور گھروں کو جگا آتا ہوں!"

"خدا کے لئے خان صاحب! دوسرے لوگوں پر تو رحم کیجئے۔ کیوں غریبوں کو بے وقت جگاتے ہیں۔"

"تمہیں کچھ دین دنیا کا پتہ بھی ہے۔ جانتے ہو سحری کے لئے جگانا کتنے ثواب کا کام ہے جو شخص ایک آدمی کو سحری کے لئے جگاتا ہے اسے تہجد کی ستر نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔ جو ستر راتوں کی عبادت کے برابر ہوتی ہے۔ جس سے عام دنوں کے سات روزوں کا ثواب ملتا ہے اور تم جانتے ہی ہو عام دنوں کے سات روزے رمضان کا ایک روزہ رکھنے کے برابر ہیں۔"

"یہ آپ نے کس کتاب میں پڑھا ہے خان صاحب! ہم نے تو ایسا کبھی نہیں سنا!"

"تو کیا تم سمجھتے ہو میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں! یہ سب ریاضی کی ایک کتاب میں لکھا تھا۔ اچھا اب تم تیار ہو جاؤ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

اس کے آدھے گھنٹے بعد میاں عبدالقدوس از روئے علم ریاضی رمضان

www.taemeernews.com



کے تمام روزے پورے کر کے آ گئے اور ہم ان کے ساتھ اپنی پہلی اور ان کی دوسری سحری کے لئے چل دیئے۔

راستے میں ایک جگہ کان پھاڑ آواز میں لاؤڈ اسپیکر پر قوالی کا ریکارڈ بج رہا تھا اور روزے داروں کو خوب غفلت سے بیدار ہونے کی تلقین کی جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میاں عبد القدوس بولے۔

"بھئی واہ ـــــ ثواب کمانے کا یہ الیکٹرانک طریقہ خوب ہے اس آواز سے تو ہزاروں لوگ سحری کے لئے بیدار ہو جاتے ہوں گے اور لاؤڈ اسپیکر کا مالک دس منٹ میں پورے رمضان کے روزوں کا ثواب کما لیتا ہوگا!"

گھر پہونچے تو سحری کا دسترخوان طرح طرح کے کھانوں سے سجا تھا سیر ہو کر کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور خان صاحب دنیا بھر کے قصے سنانے لگے مگر چار بجے کے قریب وہ چونک کر اٹھ گئے اور بولے۔

"یار کچھ بھوک سی لگ رہی ہے ذرا باورچی کھانے میں جا کر دیکھتا ہوں کچھ بچا ہے یا نہیں"

"خدا کی پناہ! سحری میں آپ کا یہ حال ہے تو روزہ شروع ہونے کے بعد کیا ہوگا؟" مگر خان صاحب سنی ان سنی کر گئے اور تھوڑی ہی دیر میں دسترخوان پھر سج گیا اس کے بعد وہ کھاتے اور ہم حیرت سے دیکھتے رہے۔

اتنے میں سحری کے گولے کی آواز سنائی دی خان صاحب اچھل گئے مگر ان کے ہاتھ نہیں رکے۔ ہم نے کہا اب بس بھی کیجئے خان صاحب!"

"ٹھہرو یار۔ ابھی وقت ہے سحری کا گولہ پانچ منٹ پہلے چھوڑا جاتا ہے"۔

اور یوں خان صاحب کی میری سحری ٹھیک چار بجکر چوبیس منٹ پر ختم ہوئی۔

۱

## افطار

آخر کار میاں عبد القدوس نے جمعہ کا روزہ رکھ لیا۔

ہم ان کی خیریت معلوم کرنے گئے تو وہ حسب توقع بستر پر لیٹے تھے۔ چہرے

www.taemeernews.com


پر مردنی چھائی تھی اور گھڑی میں ابھی صبح کے دس بجے تھے۔

"آؤ بھئی ـــــ تمہارا ہی انتظار تھا۔" ہمیں دیکھتے ہی وہ کمزور سی آواز میں بولے۔

"خیریت تو ہے خان صاحب۔ چہرا کیوں اترا ہوا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

کچھ نہیں بھائی۔ روزے کی نقاہت ہے جمعہ کا روزہ سخت بھی تو ہوتا ہے نا! خیر اللہ مالک ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو میں دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ اگر ہم لوگ ان دنوں نیوزی لینڈ میں یا قطب جنوبی کے نزدیک کسی اور مقام پر ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا تمہارے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ آج کل کافی بے دین ہوتے جارہے ہو البتہ اپنی کہتا ہوں کہ میں تو تمام روزے پابندی سے رکھتا!"

"خدا خیر کرے! یہ قطب جنوبی اور روزوں کا کیا فلسفہ نکل آیا؟"

"اوفوہ! ارے بھائی سیدھی سی بات ہے۔ قطب جنوبی کی طرف ان دنوں راتیں بے حد طویل اور دن بہت مختصر ہوتے ہیں۔ کیا سمجھے؟ سنا ہے۔ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے زیریں حصوں میں سورج طلوع ہونے کے چار گھنٹوں کے بعد غروب ہوجاتا ہے یوں سمجھ لو کہ اگر صبح چھ بجے سورج نکلے گا تو دس بجے ڈوب جائے گا۔ اب ذرا حساب لگاؤ ہم لوگ وہاں ہوتے تو سحری کھا کر سو جاتے اور صبح کو اٹھ کر افطار کر لیا کرتے۔ سارا روزہ نیند میں مکمل ہوجاتا ثواب بھی ملتا اور محنت بھی نہ کرنی پڑتی ہاں اگر بالکل قطب جنوبی پر ہوتے تو مشکل ہوجاتی۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لئے میرے عزیز کہ قطب جنوبی پر ان دنوں ہر وقت رات رہتی ہے۔ بس پندرہ بیس منٹ کے لئے سورج ذرا سا نکلتا ہے اور ڈوب جاتا ہے اب اگر ایسے میں ہم روزہ رکھتے تو ابھی سحری سے فارغ بھی نہ ہوتے کہ افطار کا گولا چھوٹ جایا کرتا اور یوں سحری اور افطاری ایک ساتھ کرنی پڑتی۔ خیر یہ سب چھوڑو کیا بجا ہوگا اس وقت۔"

"دس بج کر دس منٹ"

"اف! آہ! یہ دن کس قدر لمبا ہوگیا ہے" خاں صاحب کراہنے لگے۔ پھر جیسے کچھ یاد آگیا۔ بولے "ارے میں تو بھول گیا افطار کی بھی تو تیاری کرنی ہے۔ تمہیں تھوڑی سی تکلیف دے رہا ہوں۔ ذرا بندو میاں کے ساتھ لگ جاؤ اور اپنی نگرانی میں افطاری

www.taemeernews.com

تیار کرا دو میں نے اسے سب باتیں بتا دی ہیں تم صرف دیکھتے رہنا وہ سب کچھ ٹھیک سے بنا رہا ہے یا نہیں۔!"

بحث کرنا بے کار تھا۔ اس لئے ہم ان کے اکلوتے نوکر کے ساتھ لگ گئے افطاری کا انتظام ہوتا رہا اور خاں صاحب بیچ بیچ میں کبھی ہمیں اور کبھی بندو کو بلا کر تازہ ترین صورت حال معلوم کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی حالت بھی بگڑتی گئی۔ بریانی کی یخنی تیار ہوتے ہی ان کے ہونٹوں پر خشکی آگئی۔ کوفتوں کا قیمہ بننے پر وہ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئے۔ قورمہ پکنے کے بعد پیاس کے مارے ان کا حلق خشک ہونے لگا۔ شاہی ٹکڑے بننے تک وہ سر پر بھیگا ہوا تولیہ ڈال چکے تھے۔ اور ابھی دوپہر کا صرف ایک بجا تھا۔

نوکر سے کہنے لگے گھڑی میں چابی نہیں ہے چابی دو۔ تاؤ میں آکر بندو نے اس زور کی چابی بھری کہ گھڑی کا اسپرنگ، ایک دھماکے کے ساتھ ٹوٹ گیا ہم نے خاں صاحب سے کہا بھئی ذرا کہیں گھوم پھر کے آئیے یا بندو کا ہی کچھ ہاتھ بٹا دیجئے اس طرح بستر پر پڑے رہیں گے تو روزہ اور لگے گا!۔

اس مشورے کا ان پر کچھ اثر ہوا اور وہ بندو کے ساتھ باورچی خانے میں چلے گئے۔

ہمیں کسی کام کے لئے ذرا دیر کو باہر جانا پڑا۔ واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بندو نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔

"سرکار آپ کا روزہ ٹوٹ چکا ہے۔ اب یہ افطاری بے کار ہے۔" وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا اور خاں صاحب اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ابے گھامڑ ـــــ بھول سے کوئی چیز کھا لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔"

"مگر سرکار آپ نے تو بریانی کی پوری یخنی صاف کر دی ہے!"

"ابے تو کیا ہوا ـــــ بھول سے کھالی تھی۔ تو نے روکا کیوں نہیں۔"

"مجھے کیا پتہ تھا آپ کیا کر رہے ہیں۔ میں تو باہر کوفتوں میں مسالہ بھر رہا تھا۔" بندو نے کہا۔

"ٹھیک ہے بندو میاں۔ خاں صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بھول سے کوئی چیز کھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا تم اپنا کام جاری رکھو!" ہم نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا۔ لیکن پلٹ کر دیکھا تو خاں صاحب گلاس منہ سے لگائے غٹا غٹ پانی

www.taemeernews.com


پی رہے تھے۔

"ارے ارے خاں صاحب یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔" ہم نے انہیں ٹوکا۔

"کچھ نہیں بھول سے پانی پی رہا ہوں۔" انہوں نے گلاس منہ سے ہٹائے بغیر کہا۔

ہم نے دیکھا بندوغش کھا کر گر پڑا تھا۔

# فوٹو گرافی

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ ایک روز ہمارے ایڈیٹر نے کہا۔ "جاؤ اور جا کر سلیم پور والوں کی خیر لو!"

یہ حاتم طائیانہ سوال سنتے ہی ہمارے ہوش اڑ گئے چنانچہ ہم نے ان سے دست بستہ عرض کی کہ اے حضور جس بستی کا آپ ذکر فرما رہے ہیں وہاں پہلے سے ہی ایک تھانہ موجود ہے۔ جس میں بہت سارے پولیس والے ہیں جو دن رات وہاں کے لوگوں کی خبر لیتے رہتے ہیں لہٰذا ایسے چلتے ہوئے کام میں مداخلت کرنا نہ صرف یہ کہ غیر مناسب ہے بلکہ خطرناک بھی ہے۔

ایڈیٹر صاحب جھنجھلا گئے۔ کہنے لگے "میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ سلیم پور جا کر وہاں کے حالات پر ایک فیچر تیار کرو۔ کیا سمجھے؟ فوراً کسی فوٹو گرافر کا انتظام کرو اور ایک باتصویر فیچر لکھ کر لاؤ۔"

یہ سنتے ہی ہم فوراً ایک فوٹو گرافر کی تلاش میں چل دیئے دفتر سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ میاں عبدالقدوس ہاتھ میں کیمرا لئے ایک پیڑ سے ٹنگے ہوئے مل گئے ہم نے کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

سنتے ہی انہوں نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور

www.taemeernews.com



بولے ۔"شش! چپ رہو۔ تصویر خراب ہو جائے گی ۔"

کچھ دیر بعد ان کے کیمرے کی فلیش دو تین مرتبہ چمکی اور وہ "یاہو" کا نعرہ لگاتے ہوئے ٹارزن کی طرح پیڑ سے کود گئے ۔ ہم نے پوچھا ۔"یہ کیا ہو رہا تھا ؟"

بولے ۔"فوٹو گرافی مائی ڈیئر! دیکھ نہیں رہے ہو آسمان پر بادلوں کا یہ ٹکڑا کس قدر حسین معلوم ہوتا ہے ۔ بس اس کی تصویر کھینچ رہا تھا ۔ کل دیکھنا کتنی شاندار فوٹو نکلے گی ۔

"وہ تو ٹھیک ہے جناب لیکن آپ پیڑ پر چڑھ کر کیا کر رہے تھے ؟ ہم نے پوچھا ۔

"اوفوہ! ارے بھئی آسمان ذرا فوکس سے باہر نکل گیا تھا ۔ بس اسی کو پیڑ پر چڑھ کر فوکس میں لا رہا تھا ۔ ٹیکنیکل بات ہے تم نہیں سمجھو گے ۔!"

"اور یہ بار بار آپ فلیش کیوں چمکا رہے تھے !"

"حد ہے یار! تم تو فوٹو گرافی کی الف بے بھی نہیں جانتے ۔ دیکھتے نہیں سورج بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے جس سے دھوپ غائب ہو گئی ہے ۔ اب ایسے میں آسمان کی تصویر لینی ہے تو فلیش تو چمکانی ہی پڑے گی ۔ یہ بھی ٹیکنیکل بات ہے ۔ لہٰذا تم نہیں سمجھو گے!

"لیکن قبلہ یہ تو بتائیے کہ آخر یہ فوٹو گرافی کا چکر کیا ہے! پہلے تو ہم نے کبھی آپ کو کیمرے کے ساتھ نہیں دیکھا ۔ اور ہاں ۔ یہ کیمرہ کہاں سے اٹھا لائے ہیں ؟"

"اٹھا نہیں لایا ہوں، خود آیا ہے ۔ میرے سگے بھانجے کے سگے ماموں نے دوبئی سے بھیجا ہے پورے ساڑھے سات دینار کا انتہائی قیمتی اور بے حد عمدہ فلیش والا ولایتی کیمرہ ہے تمہیں کوئی اعتراض ہے ؟"

"واہ صاحب ۔ مجھے بھلا کیوں اعتراض ہونے لگا ۔ ذرا دکھائیے تو سہی!" ہم نے کہا ۔

انہوں نے کیمرہ ہمارے ہاتھ میں دے دیا کیمرے کا معائنہ کرتے ہوئے ہمیں ان کی سادہ لوحی پر ہنسی آ گئی ۔

معاف کیجئے خاں صاحب آپ کے بھائی صاحب کو کسی نے ٹھگ لیا ہے ۔ نہ تو یہ کیمرہ ولایتی ہے اور نہ ہی اس کا لینس بے حد عمدہ ہے !"

"کیا مطلب ؟" وہ ہمیں گھورنے لگے ۔

www.taemeernews.com


مطلب یہ کہ۔ کیمرہ ہے ایگفا انڈیا کا پرانا ماڈل کلک تھرڈ! اور لینس میں فنگس ہے! فنگس تو آپ سمجھتے ہیں نا!"

"ہاں ہاں میں سب سمجھتا ہوں۔" انہوں نے کیمرہ ہمارے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس امپورٹڈ کیمرہ دیکھ کر تمہیں حسد ہو رہا ہے۔"

"اچھا چلئے۔ جانے دیجئے۔ یہ بتائیے کہ فوٹو گرافی کا شوق اچانک کیسے ہو گیا آپ کو؟"

"اچانک نہیں ہوا میرے دوست۔ فوٹو گرافی تو میری گھٹی میں پڑی ہے۔ یہ شوق مجھے بچپن سے ہے۔ کبھی میری فوٹو البم دیکھنا۔ اس میں تمہیں میری پیدائش کے بعد سے لے کر اب تک کی کم سے کم ڈیڑھ سو تصویریں ملیں گی۔"

"جو ظاہر ہے آپ کی کھینچی ہوئی نہیں ہوں گی۔۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ فوٹو گرافی کا شوق آپ کو بچپن سے ہے۔"

"لعنت ہے! تم اخبار والے ہمیشہ بال کی کھال نکالتے ہو۔ فوٹو گرافی کے شوق کا مطلب یہ ہے کہ مجھے ہمیشہ سے فوٹو کھنچوانے کا شوق رہا ہے۔ کھینچنے کا شوق اب جا کر ہوا ہے جب کیمرہ ہاتھ آیا ہے! شاید تمہیں پتہ نہیں کہ میں نے فری لانس فوٹو گرافر بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جلد ہی ایک بہت بڑے اخبار میں ملازمت ملنے والی ہے!"

"فری لانسنگ اور نوکری! فری لانسر ہو کر آپ نوکری کیسے کر سکتے ہیں؟ اور نوکری کریں گے تو فری لانسر کہاں رہیں گے۔"

یہی تو بات ہے میرے عزیز۔ اب میں فری لانس نوکری کروں گا۔ مگر یہ ٹیکنیکل باتیں ہیں۔ تم کیا خاک سمجھو گے۔"

"چلئے یوں ہی سہی!" ہم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ "اب اگر آپ نے فوٹو گرافر بننے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو آئیے ذرا ہمارے ساتھ سلیم پور چل کر کچھ تصویریں کھینچ دیجئے۔ ہمیں وہاں کے حالات پر ایک با تصویر فیچر تیار کرنا ہے!"

یہ سنتے ہی خاں صاحب کی باچھیں کھل گئیں بولے "بھئی واہ! نیکی اور پوچھ پوچھ چلو چلتے ہیں"۔ اور ہم سلیم پور کی طرف چل دیئے۔

سلیم پور پہونچے تو بس اسٹاپ پر اترتے ہی بدبو سے دماغ پھٹنے لگا۔ یہ

www.taemeernews.com



بدبو ایک گندے نالے سے آرہی تھی جس کی شاید برسوں سے صفائی نہیں ہوئی تھی ہم نے خاں صاحب سے نالے کی تصویر لینے کے لئے کہا۔

"اس طرح تصویر کھینچئے خان صاحب کہ نالے کی گندگی پوری طرح نمایاں ہو جائے!"

"فکر نہ کرو،" خان صاحب نے کہا اور نالے کی منڈیر پر چڑھ کر کیمرہ سیٹ کرنے لگے۔ کافی دیر تک کیمرے کو آڑا ترچھا کرنے کے بعد بھی وہ مطمئن نہ ہوئے اور انکار میں سر ہلاتے ہوئے منڈیر سے تصویر لئے بغیر اُتر آئے۔

ہم نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ تصویر کیوں نہیں لی!"

وہ بولے "نالے کا اینگل غلط ہے۔ نہ جانے پی ڈبلیو ڈی میں کیسے کیسے گھامڑ پڑے ہوئے ہیں۔ ایک نالہ بھی سیدھا نہیں بنا سکتے۔"

"چلیے کوئی بات نہیں۔ آپ ٹیڑھے نالے کی ہی تصویر لے لیجئے۔" ہم نے کہا۔

"تم کہتے ہو تو کھینچ لوں گا۔ لیکن ایک بات صاف بتائے دیتا ہوں۔ ٹیڑھے نالے کی تصویر کھینچی تو فوٹو میں بدبو صاف نہیں آئے گی!"

"کیوں مزاق کرتے ہیں خاں صاحب۔ بدبو بھی بھلا کہیں دکھائی دیتی ہے۔"

"واہ بھئی۔ دکھائی کیوں نہیں دیتی۔ تم نے وہ نظم نہیں سنی۔ ہم نے دیکھی ہے ان آنکھوں کی مہکتی خوشبو۔ پیار کو پیار ہی رہنے دو کوئی نام نہ دو۔ جب خوشبو دکھائی دے سکتی ہے تو بدبو کیوں نہیں دکھائی دے گی! آؤ چلو نالے کے اس طرف چلتے ہیں میرا خیال ہے وہاں سے اینگل ٹھیک آجائے گا!"

ہم ان کے ساتھ نالے کے پار چل دیئے۔ وہاں بھی خاں صاحب کبھی کھڑے ہو کر کبھی بیٹھ کر اور کبھی دائیں بائیں جھک کر اینگل تلاش کرتے رہے مگر وہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر تھک ہار کر بولے۔

"لعنت ہے! یہ کم بخت سورج ہر فریم میں آجاتا ہے۔ اسے بھی آج نالے کی طرف سے ہی نکلنا تھا؟ آؤ دوسری طرف چلتے ہیں۔"

لیکن اینگل اس طرف بھی نہیں ملا جھنجھلا کر کہنے لگے۔ "اس طرف سے سارے نالے پر عمارتوں کا سایہ پڑ رہا ہے۔ تصویر کیا خاک آئے گی۔ سمجھ میں نہیں آتا ہمارے شہریوں کو شہری آداب کب آئیں گے۔ عمارت بناتے ہوئے اس بات کا بھی دھیان نہیں رکھتے کہ اس کا سایہ نالے پر بھی پڑ سکتا ہے۔"

www.taemeernews.com



"میری مانئے تو خاں صاحب پل سے ہی تصویر لے لیجئے۔"، ہم نے مشورہ دیا۔

"یار کمال ہے! فوٹو گرافر تم ہو یا میں؟ کچھ خبر بھی ہے فوٹو لیتے وقت اینگل کا صحیح ہونا کس قدر ضروری ہے؟ اس نالے کا سارا اینگل غلط ہے۔ میں اس کی تصویر کھینچ کر اپنا کیریئر خراب نہیں کروں گا۔ اخبار میں ٹیڑھے نالے کی تصویر چھپے گی تو لوگ کیا کہیں گے دیکھ کر۔ لہٰذا اس نالے کو چھوڑو۔ آگے چلو۔ فیچر کے لئے اور بہت سی تصویریں مل سکتی ہیں۔"

ہم نے ہتھیار ڈال دیئے اور انہیں (خاں صاحب کو) ساتھ لے کر آگے بڑھ گئے۔

ایک جگہ بچوں کے کھیلنے کا پارک دیکھ کر ہم سناٹے میں آگئے۔ پارک میں اتنی گندگی تھی اور ملبے کے اتنے ڈھیر پڑے تھے کہ اس میں بچوں کے کھیلنے کی تو کیا قدم رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی ایک طرف پارک میں بچوں کے کھیلنے کی سیڑھیاں اور جھولے لگے ہوئے تھے اور قریب ہی ایک گائے اور چند سور ملبے میں منھ مار رہے تھے۔

"مل گئی خان صاحب۔ اس سے اچھی تصویر شاید نہیں ملے گی۔ فوراً سیڑھیوں اور جھولوں کے ساتھ ان جانوروں کی تصویر کھینچ لیجئے۔ تصویر چھپتے ہی تہلکہ مچ جائیگا" ہم نے کہا۔

خان صاحب بھی اس منظر کی معنویت سے مرعوب ہوگئے اور فوراً کیمرے کو فوکس کرنے لگے۔

"یہاں سے سیڑھیاں فریم میں نہیں آرہی ہیں آؤ اس مکان کے زینے میں چلتے ہیں۔ وہاں سے پورا سین ملے گا"، کچھ دیر بعد وہ بولے۔

ہم ان کے ساتھ زینے میں پہونچ گئے۔ وہاں چڑھ کر وہ فوکس ملا ہی رہے تھے کہ نہ جانے کیوں سور بھاگ کر فریم سے نکل گئے۔ خان صاحب نے فوراً لاحول پڑھی اور گائے کو فوکس میں لانے لگے کچھ دیر بعد بولے۔

"لعنت ہے اس جانور کی عقل پر! صحیح اینگل پر کھڑے ہو کر چرنا بھی نہیں آتا۔"

کوئی بات نہیں خان صاحب۔ جیسا بھی اینگل ہو کھینچ لیجئے۔"

"یار پلیز! ——— تم چپ رہو تمہاری آواز سے ساری فوٹو خراب ہو جائے گی!"

www.taemeernews.com



انہوں نے کہا اور دوبارہ گائے کو قید کرنے میں جٹ گئے آخر کار گائے ٹھیک اینگل پر آکر چرنے لگی۔

"آگئی آگئی! اب چپ رہنا۔ میں بٹن دبا رہا ہوں۔" خان صاحب نے کہا مگر بٹن دباتے ہی چونک گئے۔ بولے۔

"توبہ ہے! ــــــ ابھی کیمرے میں فلم تو ڈالی ہی نہیں ہے۔"

اس کے بعد جب تک وہ کیمرے میں فلم ڈالتے گائے پارک سے چلی گئی اور جب تک ملبے اور بچوں کی سیڑھیوں کو اینگل میں لاتے تب تک کارپوریشن والے ہمیں دیکھ کر فوٹو کھینچنے کے ڈر سے جلدی جلدی ملبہ اٹھا کر لے گئے۔

# طلسمی انگوٹھی

آپ نے طلسمی انگوٹھی کے بارے میں سنا ہوگا کہ اس کے پہننے سے دل کی ہر مراد پوری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سرمہ سلیمانی کے بارے میں بھی جانتے ہوں گے کہ اسے آنکھ میں لگانے سے اندھے بھی پٹ پٹ دیکھنے لگتے ہیں اور زمین میں گڑے دفینے تک نظر آجاتے ہیں۔ ایسے ہی طلسمی تعویذ ہوتا ہے، جسے گلے میں ڈالنے سے ،،کل قبضے میں کئے جا سکتے ہیں یہ سب چیزیں آپ پرانی دہلی سے نکلنے والے کسی بھی دینی یا فلمی رسالے کو خط لکھ کر بذریعہ وی پی منگوا سکتے ہیں (نوٹ تینوں چیزیں ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ عموماً معاف کر دیا جاتا ہے)۔

مگر آپ جانتے ہیں کہ نقال آج کل ہر جگہ بھرے پڑے ہیں اس لئے رسائل وجرائد

www.taemeernews.com


کے ذریعہ ملنے والی طلسمی اشیاء کی گارنٹی دینا مشکل ہے۔ اکثر دھوکہ ہو جاتا ہے جیسے۔ ہمارے ساتھ ہو چکا ہے۔

ہوا یہ کہ ایک مرتبہ ہم نے ایک دینی و فلمی رسالے سے طلسمی انگوٹھی منگا کر انگلی میں پہنی مگر جس دن سے انگوٹھی پہنی اسی دن سے ہمارے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آنے لگے۔

طلسمی انگوٹھی ہم نے اس لئے خریدی تھی کہ ہمارے کچھ رکے ہوئے کام پورے ہو جائیں مثلاً۔ ایک تو یہ کہ مٹی کے تیل کا ڈپو الاٹ ہو جائے جس کے لئے ہم تین سال سے فوڈ اینڈ سپلائی ڈپارٹمنٹ کے افسر کی خوشامد کر رہے تھے۔ دوسرے گیس کا کنکشن مل جائے جس کی درخواست دیئے ہوئے چار برس ہو چکے تھے۔ اور تیسرا یہ کہ پڑوسی کا ریڈیو ٹھیک ہو جائے جو پانچ برس سے ہمارے نیند پر قبضہ کئے بیٹھا تھا۔

لیکن جیسے ہی ہم نے انگوٹھی پہنی اس نے الٹا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ فوڈ آفیسر کی ترقی ہو گئی اور اس کا تبادلہ کسٹم ڈپارٹمنٹ میں ہو گیا گیس کمپنی کے افسر کی پچاس لاکھ روپے کی لاٹری نکل آئی اور اس نے نوکری چھوڑ کر پرچون کی دکان کھول لی۔ رہا پڑوسی تو اس کا ریڈیو ٹھیک ہو گیا اور وہ اسے پہلے سے دوگنے والیوم پر بجانے لگا۔

پے در پے یہ صدمے جھیلنے کے بعد ہم رسالہ ہٰذا کے دفتر پہونچے اور ایڈیٹر صاحب سے عرض کی کہ جناب آپ نے جو انگوٹھی ہمیں بیچی ہے اس میں مینو فیکچرنگ ڈفیکٹ ہے کیونکہ یہ بجائے ہمارے، دوسروں کے دل کی مرادیں پوری کر رہی ہے۔ لہٰذا تاجرانہ اصولوں کے مطابق یا تو اس کا ری پلیسمنٹ دیجئے یا پھر ہماری رقم واپس کیجئے!

ایڈیٹر صاحب نے بڑی نخوت کے ساتھ پہلے ہمیں پھر انگوٹھی کو دیکھا اور پھر موٹے لینس والی ایک عینک آنکھوں پر لگا کر ہمیں گھورتے ہوئے بولے "دیکھئے صاحب ہمارا اصول یہ ہے کہ ایک بار خریدا ہوا مال نہ تو واپس لیتے ہیں نہ تبدیل کرتے ہیں پھر بھی چونکہ آپ دیکھنے میں غریب غربا معلوم ہوتے ہیں اس لئے صرف اتنا ہو سکتا ہے کہ اس کی مرمت کرا دی جائے۔ بولئے منظور ہو تو چھوڑ جائیے اور اگلے ہفتے آ کر لے جائیے۔"

ہم جو ان کی عینک سے پہلے ہی سہمے ہوئے تھے، شکریئے کے ساتھ انگوٹھی وہیں

www.taemeernews.com



اگلے روز ہماری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا ایک ساتھ تین خبریں ملیں۔ پہلی یہ کہ نئے فوڈ آفیسر نے ہماری درخواست منظور کر لی تھی۔ دوسری یہ کہ گیس کا کنکشن آگیا تھا اور تیسری یہ کہ پڑوسی کا ریڈیو گر کر ٹوٹ گیا تھا۔
یہ انگوٹھی پہننے کا کرشمہ تھا یا اسے اتارنے کا نتیجہ۔ ہم آج تک نہیں سمجھ پائے ہیں۔

# منزل دور نہیں

پچھلے بیس پچیس برسوں میں میڈیکل سائنس میں مصنوعیت نے بڑی زبردست ترقی کی ہے اور ایک سے ایک حیرت انگیز ایجادات سامنے آئی ہیں۔
پہلے مصنوعیت صرف مصنوعی دانتوں اور مصنوعی آنکھوں تک محدود تھی۔ لیکن اب یہ انسانی جسم کے دوسرے حصوں پر بھی پھیل گئی ہے۔
مصنوعی ہاتھ مصنوعی پیر اور مصنوعی دل تیار ہو چکے ہیں۔ فائبر کی مصنوعی

ہڈیاں اور مصنوعی سنتھیٹک خون بنانے کی کوششیں کامیابی کے قریب ہیں۔ یہی نہیں مصنوعی پھیپھڑے مصنوعی گردے، مصنوعی جگر اور مصنوعی دماغ تیار کرنے کی بھی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اور کامیابی کی منزل بہت دور نہیں معلوم ہوتی۔
اگر سائنس اسی رفتار سے ترقی کرتی رہی تو امید کرنی چاہیئے کہ اس صدی کے ختم ہونے تک مزید مصنوعی اعضاء ایجاد ہو جائیں گے اور اگلی صدی میں شاید عام طور پر استعمال بھی ہونے لگیں گے۔

www.taemeernews.com



مصنوعی انسانی اعضاء کے عام ہو جانے سے جس انقلاب کا آغاز ہوگا، اس سے انسانی تہذیب و ارتقاء کا ایک ایسا شاندار اور سنہری دور شروع ہوگا جس کی دوسری مثال ہماری تو کیا مغلوں کی تاریخ میں بھی نہ ملے گی۔

اب سے تیس چالیس برس بعد جب ہم کسی دفتر میں جائیں گے تو کچھ اس طرح کی باتیں سننے کو ملا کریں گی۔

"ارے بھئی چوپڑا! یار ہمارے ٹی اے ڈی اے بلوں کا کیا ہوا۔"

"ہوتا کیا کل ہی پاس ہو گئے تھے بس اب چیک تیار ہونے باقی ہیں۔"

"بھئی واہ۔ پھر تو آج چیک مل جائے گا۔"

"نہیں ٹنڈن صاحب کے دائیں ہاتھ میں آج کچھ گڑبڑ ہے۔ مستری کے پاس ٹھیک کرانے بھیجا ہے۔ مجھے لگتا ہے آج دستخط نہیں ہو پائیں گے۔!"

"ہت تیرے کی! یار یہ چیف اکاؤنٹنٹ بڑا غلط آدمی ہے۔ جب بھی ہم لوگوں کے چیک بننے ہوتے ہیں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہو جاتی ہے۔ پچھلے ہفتے کنوینس بل کے چیک پر سائن کرانے گیا تو کہہ دیا آج نہیں کل سائن کروں گا آج میرا انگوٹھا کام نہیں کر رہا ہے۔ پھر ایک دن اوور ٹائم کے چیک سائن کرنے کو دیئے تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میری ناک اوور ہالنگ کے لئے گئی ہوئی ہے کل سائن کرا لینا۔"

"قہہ قہہ قہہ ـــــ ناک؟ بھئی واہ۔ ناک کا دستخط کرنے سے بھلا کیا تعلق ہے؟"

"ہے یار۔ ٹنڈن کی ناک کا ہے۔ اتنے موٹے شیشوں کی جو عینک لگاتا ہے وہ ناک پر ہی تو ٹکتی ہے!"

لوکل بسوں اور ٹرینوں میں کچھ ایسی باتیں ہوں گی۔

ایک مسافر دوسرے مسافر سے۔ "بھائی صاحب آپ کے ہاتھ ماشاءاللہ بڑے مضبوط اور خوبصورت ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں یہ آپ نے کہاں سے خریدے ہیں؟"

دوسرا مسافر، "تعریف کے لئے شکریہ جناب! دراصل یہ غیر ملکی ہاتھ ہیں یعنی امپورٹڈ! میرے سالے کا بہنوئی دوبئی سے لایا تھا۔"

پہلا مسافر، "کیا بات ہے صاحب! دوبئی کے مال کا جواب نہیں۔ ایک آدھ جوڑا اور بھی تو ہوگا۔ آپ کے سالے کے بہنوئی کے پاس!"

دوسرا مسافر، "اجی کہاں جناب! چھ جوڑے لایا تھا۔ سب کے سب بھائی بہنوں میں

www.taemeernews.com



بٹ گئے آپ تو جانتے ہی ہیں آج کل امپورٹڈ مال کی کیسی کریز ہے۔ پچھلے مہینے میں نے ایک دوست کے ذریعہ سنگاپور سے جاپانی ٹانگوں کے چھ جوڑے منگائے تھے۔ بڑی مشکل سے ایک جوڑی ٹانگیں بچا پایا۔ باقی سب چھوٹے بھائی اور عزیز رشتے دار اڑا کر لے گئے۔"

پہلا مسافر" سچ کہہ رہے ہیں آپ۔ دیسی سامان کی تو کچھ قدر ہی نہیں ہے امپورٹڈ مال کے چکر میں دن رات ٹھگے جاتے ہیں پھر بھی لوگوں کو عقل نہیں آتی میری بیوی پچھلے ہفتے چاندنی چوک سے ایک سستی جاپانی ناک خرید لائی دیکھنے میں بڑی خوبصورت اور ستواں تھی۔ استعمال میں بھی ٹھیک معلوم ہوتی تھی۔ مگر جب اس نے ایک پھیری والے سے دہرہ دونی باسمتی چاول کی ایک بوری سستے میں خرید لی اور پکانے پر پتہ چلا کہ وہ باسمتی نہیں سابرمتی کے چاول تھے جن سے کوئی بھی خوشبو نہیں آرہی تھی تو پتہ چلا کہ ناک کی ٹیوننگ میں گڑبڑ تھی۔ بس جناب اب اس ناک کو مستری کے پاس لے جانا پڑا مستری نے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ بھائی صاحب یہ تو ہانگ کانگ کا مال ہے۔ ٹھیک کرنے میں کافی خرچ آئے گا اس لئے ٹھیک کرانے سے اچھا یہ ہوگا کہ نئی خرید لیجئے۔"

دوسرا مسافر" ہاں جی ازمانہ بڑا خراب آگیا ہے۔ ہر چیز دیکھ بھال کر خریدنی چاہیئے ویسے آپ کے پیر بڑے عمدہ ہیں لگتا ہے آج ہی خریدے ہیں کیا؟ بالکل نئے دکھائی دے رہے ہیں۔"

پہلا مسافر" جی نہیں۔ انہیں تو چھ مہینے سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ جامع مسجد سے سیکنڈ ہینڈ خریدے تھے۔ کیونکہ پیر میں ہمیشہ سیکنڈ ہینڈ ہی خریدتا ہوں۔ یہ اتفاق سے کچھ زیادہ اچھے نکل آئے۔"

تیسرا مسافر" معاف کیجئے بھائی صاحب آپ کو تھوڑی سی تکلیف دے رہا ہوں ذرا ایک منٹ کے لئے سیٹ سے اٹھ جائیے۔"

دونوں مسافر" کیوں؟"

تیسرا مسافر" ذرا سیٹ کے نیچے دیکھنا ہے میرا ایک کان کہیں گر گیا ہے! آج ہی چاندنی چوک سے خریدا تھا۔"

www.taemeernews.com


# کمرشیل ازم

صنعتی انقلاب کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں سب کچھ کمرشیل ہو گیا ہے لین دین کاروبار اور سماجی روابط میں ہی نہیں نظریوں عقیدوں اور اصولوں یہاں تک کہ باہمی رشتوں میں بھی کمرشیل ازم آگیا ہے۔ ہر اچھی تبدیلی کو بہت جلد تجارتی نظر سے دیکھا جانے لگتا ہے اور ہر مفید ایجاد تجارتی مقابلہ آرائی کے گرداب میں پھنس جاتی ہے۔

لہٰذا جب مصنوعی انسانی اعضاء بڑے پیمانے پر تیار ہونے لگیں گے اور سرجری کی سائنس میں زبردست ترقی کے بعد صرف معذور ہی نہیں بلکہ غیر معذور افراد بھی ان کا استعمال کرنے لگیں گے تو یقین رکھنا چاہیئے کہ یہ انقلاب بھی جلد ہی کمرشیل ازم کے اثر میں آجائے گا اور ان مفید ایجادات کو لے کر بھی تجارتی مقابلہ آرائی شروع ہو جائے گی۔

تجارتی مقابلوں میں استعمال ہونے والا سب سے بڑا ہتھیار ہے اشتہار ——

اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کچھ ایسے اشتہار سامنے آیا کریں گے۔

اشتہار نمبر ۱ جینے کی امنگ۔ باٹا کے سنگ۔

آپ کی پہلی پسند باٹا۔

جی ہاں باٹا کی ٹانگیں اور پیر مضبوط ٹکاؤ اور سستے۔ ہر منزل کے ساتھی۔ میلوں چلیں پھر بھی نہ تھکیں۔

ہر موسم کے لئے باٹا کی ٹانگیں اور پیر۔ ہر جوڑے کے ساتھ ایک باٹا ہوائی چپل مفت۔

اشتہار نمبر ۲ سیل سیل سیل بڑی کمپنیوں کے بڑھیا کوالٹی والے ہاتھ پیروں کی شاندار سیل۔

جلدی کیجئے بمبئی سے آخری ٹرک آگیا ہے۔ آخری ٹرک آخری لاٹ آخری ہفتہ۔ یہ موقع بار بار نہیں آئے گا۔

www.taemeernews.com



ہر نمبر اور ہر سائیز کی ٹانگیں پیر اور ہاتھ جوتوں اور دستانوں کے بھاؤ خریدنے کا بہترین موقع ہے۔

مال نقلی ثابت کرنے والے کو ایک ہزار ایک روپے کا اصلی مال دیا جائے گا۔

نوٹ :۔ امپورٹڈ آنکھیں، دانت ناک اور کان بھی رعایتی داموں پر دستیاب ہیں۔

ریڈیائی اشتہار کچھ اس قسم کے ہوں گے۔

اجی میں نے کہا سنتے ہو؟ دفتر جا رہے ہو تو میرے کان لانا مت بھولنا۔

ٹھیک ہے بھئی لے آؤں گا۔

مگر سنو ـــــ ایسے ویسے کان مت اٹھا لانا مجھے صرف لکھی رام اینڈ کمپنی کے کان چاہئیں ـــــ بھیا کی شادی میں پہن کر جاؤں گی!۔

جی ہاں اسٹیریو فونک ساؤنڈ کے لئے یاد رکھئے لکھی رام اینڈ کمپنی کے کان جو دیکھنے میں بھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ لکھی رام اینڈ کمپنی مین برانچ بیڈن پورہ بس اسٹینڈ کے سامنے۔ دھیان رہے لکھی رام اینڈ کمپنی کی کوئی اور برانچ نہیں ہے۔ ٹرن ٹرن ٹن۔

ٹیلی ویژن کے اشتہاروں کا انداز کچھ ایسا ہوگا۔

کیا آپ کو زکام ہے؟

ہاں۔

کیا سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے؟

ہاں ہاں

کیا آپ کی ناک بند رہتی ہے؟

ہاں بھئی ہاں!

تو سر درد کی گولی کیوں؟ کوئی اچھی سی ناک کیوں نہیں لگا لیتے؟

وہ تو ٹھیک ہے مگر کون سی ناک خریدوں۔

بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ پریسٹیج کی ناک لگاؤ اور ہمیشہ کے لئے نزلے اور زکام اور خراٹوں کو بھول جاؤ۔

اچھا!؟

ہاں۔ یہ دیکھو دوسری کمپنیوں کی ناک دیکھنے میں تو خوبصورت ہوتی ہے مگر

www.taemeernews.com


ان کے سوراخ پوری طرح گول ہوتے ہیں نہ ہی ان میں جراثیم اور دھول وغیرہ کو روکنے کا صحیح انتظام ہوتا ہے جب کہ پریسٹیج کے نتھنے نہ صرف گول ہیں بلکہ ان میں فائبر کے امپورٹڈ خوشبودار ریشے بھی لگے ہوتے ہیں جو باہر کی کسی چیز کو اندر نہیں جانے دیتے۔ اس سے نہ صرف آپ ناک کی تمام بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں بلکہ سانس بھی ہر دم خوشبودار اور تازہ رہتی ہے۔ لہٰذا آپ بھی خوش آپ کی بیوی بھی خوش!

پھر تو ٹھیک ہے میں آج ہی پریسٹیج کی ناک خرید لیتا ہوں۔ جی ہاں۔ جو بیوی سے سچ مچ کرتے پیار وہ پریسٹیج سے کیسے کریں انکار؟

اشتہارات کے علاوہ خبروں میں بھی اس کاروباری آپا دھاپی کا عکس دکھائی دے گا طوالت کے خوف سے تفصیلی خبروں کی بجائے ان کی سرخیوں پر اکتفا کیا جاتا ہے چند خبریں ملاحظہ ہوں۔

خبر نمبر ۱۔ نئی امپورٹ پالیسی سے مصنوعی اعضاء کی قیمتوں میں اضافہ یقینی۔ حکومت سے پالیسی پر نظر ثانی کا مطالبہ۔

خبر نمبر ۲۔ کمزور طبقوں کو مضبوط ہاتھ پیر خریدنے کے لئے بلا سود قرضے دیئے جائیں گے وزیر سماجی بہبود کا اعلان۔

خبر نمبر ۳۔ عورتوں کے ناک کان چھیلنے والا گروہ سرغنہ سمیت گرفتار۔

خبر نمبر ۴۔ دوبئی سے سونے کے دانت لاتے ہوئے پکڑا گیا۔

خبر نمبر ۵۔ نیپال کی سرحد پر بھاری تعداد میں چینی آنکھیں پکڑی گئیں دو اسمگلر گرفتار۔

خبر نمبر ۶۔ پنجاب اور کشمیر میں غیر ملکی ہاتھ برآمد۔

www.taemeernews.com



# سگریٹ چھوڑنے کے نقصانات

تمباکو نوشی کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں نقصانات گنائے جاتے ہیں۔ پھیپھڑے خراب ہو جاتے ہیں ہر دم کھانسی رہنے لگتی ہے دمہ ہو جاتا ہے بھوک گھٹ جاتی ہے بدن کمزور پڑ جاتا ہے جس سے دوسری بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ کینسر بھی ہو جاتا ہے بہت سی نفسیاتی اور اعصابی بیماریاں بھی کہتے ہیں کہ تمباکو نوشی سے ہی ہوتی ہیں۔ بلکہ بعض اقتصادی ماہرین تو یہ کہتے ہیں کہ اکثر لوگوں کی معاشی بدحالی کا سبب بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ سگریٹ بیڑی پر پھونک دیتے ہیں۔

جہاں تک بیڑی سے نقصان ہونے کی بات کا تعلق ہے تو اس سے ہمیں دو سو فیصد اتفاق ہے کہ اس نامعقول، بدشکل کراہت آمیز گھناؤنی اور بدبودار شے سے سوائے ایم کالے خان حنیف ساگر سی پی کے کسی کو فائدہ نہ ہوا ہوگا۔

اور اگر ہوا ہے تو ہمیں اس کی پرواہ نہیں ہوتا رہے۔ ہمیں تو بیڑی سے پہلے بھی بلاواسطے کا بیر تھا آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ نہ جانے کیوں بچپن سے یہ بات بری طرح ہمارے دماغ میں جم چکی ہے کہ بیڑی پینے والا آدمی شریف نہیں ہو سکتا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بہت سے انتہائی شریف لوگوں سے ہمارے تعلقات ابھی تک صرف اس لئے استوار نہیں ہو سکے ہیں کہ وہ بیڑی پیتے ہیں۔

تاہم سگریٹ نوشی سے نقصان ہونے پر ہمیں شک ہے ہم اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ سگریٹ نوشی سے جتنا نقصان ہوتا ہے وہ اس نقصان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو سگریٹ نوشی ترک کرنے سے ہوتا ہے۔

www.taemeernews.com



آپ نے وہ قصہ تو سنا ہوگا کہ ایک عالیشان دس منزلہ ہوٹل کے بار روم میں ایک تگڑا اور صحت مند شخص سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک اینٹی سگریٹ شخص کے پیٹ میں درد ہونے لگا اور اسے نصیحت کرنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔

اس نے جا کر پوچھا کہ جناب آپ کتنی سگریٹ روزانہ پیتے ہیں۔ اس شخص نے کہا یہی کوئی چار پانچ پیکٹ۔ تب اس نے پوچھا کہ ایک پیکٹ کتنے روپے کا آتا ہے اور یہ کہ وہ کب سے سگریٹ پی رہا ہے۔

جواب ملا کہ ایک پیکٹ کی قیمت بیس روپے ہے اور وہ بیس سال سے اسی برانڈ پر اٹکا ہوا ہے۔

یہ سن کر اس نے جیب سے کاغذ پنسل نکال کر کچھ حساب لگایا اور پھر اپنی دانست میں اسے ایک زبردست ذہنی جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔

"برخوردار، اگر تم نے سگریٹ کی عادت نہ ڈالی ہوتی اور اس پر خرچ ہونے والی رقم بچائی ہوتی تو آج تم یہ عالیشان ہوٹل خرید سکتے تھے۔"

اس پر وہ آدمی حیرت سے پلکیں جھپکانے لگا اور مسکرا کر بولا۔

"جناب اس ہوٹل کا مالک میں ہی ہوں!"

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ یہ قصہ ہم نے تب سنا جب اینٹی سگریٹ پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر ہم سگریٹ نوشی ترک کر چکے تھے! اگر پہلے سے سنا ہوتا تو کبھی ایسی حماقت نہ کرتے اور آج ہم بھی کسی عالیشان ہوٹل کے نہیں تو کسی ڈھابے کے ضرور مالک ہو چکے ہوتے۔

آہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب ہم خوب سگریٹ پیتے تھے اور منہ تو کیا ہاتھوں کی انگلیاں تمباکو سے مہکتی تھیں۔ جب کوئی دوست ہمارے سگریٹ زدہ ناخن دیکھ کر ہمیں سرطان ہونے کا یقین دلاتا تو ہم اس کی غلط فہمی پر خوب ہنستے اور اسے بتاتے کہ بھیا، سگریٹ پینے سے سرطان نہیں کینسر ہوتا ہے جو خدا کے فضل ہمیں ابھی تک نہیں ہوا ہے۔

اگر کوئی شخص سگریٹ کے نقصانات گنا کر ہمیں ڈرانے کی کوشش کرتا تو

www.taemeernews.com


ہمارا جواب عموماً اس طرح کا ہوتا تھا کہ۔

"بھائی صاحب خرابی سگریٹ نوشی میں نہیں اس کی لت میں ہے اور لت ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ہمیں کسی چیز کی لت نہیں۔ سگریٹ پیتے ہوئے ہمیں بیس سال ہو گئے مگر مجال ہے جو آج تک لت پڑی ہو!"

اگر وہ تب بھی نہ مانتا تو ہم اسے بتاتے کہ۔

بھئی۔ بندۂ خدا۔ ہم زیادہ سگریٹ نہیں پیتے ہیں۔ بلکہ رات کو سونے کے بعد تو سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے ہیں۔ چاہو تو ہمارے گھر والوں سے پوچھ لو۔ انہوں نے ہمیں کبھی نیند میں سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔ اور دن میں بھی بھلا کیا پیتے ہیں۔ بس مشکل سے ایک پیکٹ صبح ناشتے کے بعد دو ڈھائی پیکٹ دوپہر کھانے کے بعد اور ایک دو رات کو سونے سے پہلے۔ بس! اس سے زیادہ سگریٹ ہم نے کبھی نہیں پی ہے!"

یہ سن کر وہ شخص اتنا مرعوب ہوتا کہ چیخ مار کر بھاگ جاتا اور پھر کبھی ہماری سگریٹ نوشی پر انگلی اٹھانے کی کوشش نہ کرتا۔

مگر صاحب کسی نے سچ کہا ہے۔ آدمی کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ ہمیں بھی نہیں لگی۔ ایک روز تبلیغی جماعت کے چلّے سے واپس آنے والے ہمارے ایک دوست نے سگریٹ کے خلاف ایسا پر اثر وعظ دیا اور پھیپھڑے و گلے کے کینسر کی ایسی ایسی بھیانک تصویریں ایک کتاب سے نکال کر دکھائیں کہ ہم عین جوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور بیس برس پرانی وہ سگریٹ نوشی ترک کر دی جو ابھی لت کی حالت کو بھی نہ پہونچی تھی۔

بس اس روز سے ہمارے گردش کے دن شروع ہو گئے۔

پہلا جھٹکا ذہن کو تب لگا جب دعوتوں میں ہمیں کلاسیک، پانچ سو پچپن، ڈن ہل اور امریکن ایکسپریس جیسی منہگی سگریٹیں پیش کی گئیں اور ہمیں ہر اظہار معذرت پر ہونے والے نقصان کا اندازہ ہونے لگا۔

پھر ایک دن معلوم ہوا کہ ہماری خوراک بڑھ گئی تھی جو کچھ کھاتے تھے، فوراً ہضم ہو جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم صبح کے ناشتے کے بعد ایک اور ناشتہ کر کے دوپہر کو لنچ کے بعد ایک اور لنچ لیتے اور شام کو ڈنر کے بعد ایک اور ڈنر لے کر بھوکے پیٹ سو جاتے۔

www.taemeernews.com


اس سب کا اثر یہ ہوا کہ نہ صرف گھر کا بجٹ دوگنا ہو گیا بلکہ کپڑے بھی تمام چھوٹے پڑ گئے۔ آخر کار بنیئے سے بیس فیصد ماہانہ کے رعایتی سود پر رقم قرض لے کر بزاز سے کپڑا خریدا اور بزاز سے پچیس فیصد ماہانہ پر قرض لے کر درزی سے چند جوڑے سلوائے۔ تب کہیں جا کر دوستوں کو یقین آیا کہ ہم اپنے چھوٹے بھائیوں کے نہیں بلکہ خود اپنے کپڑے پہنتے ہیں۔

مگر یہ کپڑے بھی چند ماہ بعد چھوٹے پڑ گئے نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر بنیئے اور بزاز کا مرہون منت ہونا پڑا۔

بات یہیں تک رہتی تو صبر آجاتا مگر ایک روز معلوم ہوا کہ عزت بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ایک روز دفتر میں ایک صاحب، جن کی سگریٹ نوشی دوسروں کے پیکٹوں کے سہارے چلتی تھی، ہمارے پاس آئے اور بولے۔

"یار بہت دن ہو گئے تم نے سگریٹ ہی نہیں پلائی۔ لاؤ ذرا پیکٹ نکالو!"

"معاف کیجئے جناب۔ ہم نے سگریٹ عرصہ ہوا چھوڑ دی ہے۔!"

"سگریٹ چھوڑ دی ہے۔؟" وہ آنکھیں پھاڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ پھر اپنی جیب سے ایک مڑی تڑی سگریٹ نکال کر بولے۔ "اچھا تو چلو ماچس ہی نکالو۔!"

"جی۔ ماچس بھی چھوڑ دی ہے" ہم نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ماچس بھی!؟" اس مرتبہ ان کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ کچھ حقارت بھی تھی۔ انہوں نے سگریٹ جیب میں رکھی اور بولے "میں تمہیں اتنا کنجوس نہیں سمجھتا تھا!"

ایک دن تنگ آکر ہم نے دوبارہ سگریٹ شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا! مگر تبھی ہماری نظر کھونٹی سے لٹکتی قمیص اور پتلونوں پر پڑی اور ہم سوچنے لگے

ان کپڑوں کا کیا ہوگا!؟

www.taemeernews.com



# فون خراب ہے

ایک ہفتے خدا کا کرنا کیا ہوا کہ دہلی مہانگر ٹیلی فون نگم کے دو کرمچاری ہمارے گھر آئے اور پندرہ منٹ تک دیواروں پر ادھر ادھر کچھ فٹنگ کرنے کے بعد ہمیں اپنی کالونی کا دی آئی پی بنا کر چلے گئے۔ دی آئی پی بننے کی خوشی میں ہم نے فوراً ہنگامی طور پر بچوں میں بتاشے تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور آٹو رکشہ پر پچیس روپے خرچ کر کے گلی بتاشے والی سے سوا روپے کے بتاشے خرید لائے۔

لیکن گھر آئے تو دیکھا دروازے پر محلہ والوں کی لائن لگی ہوئی ہے۔ ابھی ہم یہ سوچ کر حیران ہو ہی رہے تھے کہ ہمارے بتاشے لانے کی بات اتنی جلدی سب کو کیسے معلوم ہو گئی کہ ہمیں آتے دیکھتے ہی قطار ایسے ٹوٹ گئی جیسے ہم نہ آئے ہوں، ڈی ٹی سی کی بس آ گئی ہو سب نے ہمیں گھیر لیا۔ اور بعض نے تو ہمارا بازو اس طرح تھام لیا جیسے وہ بس کے دروازے کا ڈنڈا ہو۔

ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ سب لوگ ایک ایک کر کے ہم پر سوار نہ ہو جائیں مگر جب ان کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار دیکھے تو یہ اندیشہ جاتا رہا۔ دھکم پیل دراصل اس لئے تھی کہ سب کے سب ہمیں مبارکباد دینے کے لئے بے تاب تھے۔

"مبارک ہو میاں جی ——— آپ اس گلی میں پہلے سجن ہیں جنہیں ٹیلی فون واسمان پراپت ہویا ہے!" چوپڑا جی نے ہمیں ہار پہناتے ہوئے کہا۔

"بہت بہت بدھائی ہو جی ——— میں آپ کا سب سے پہلا پڑوسی ہوں سیوک

www.taemeernews.com


رام! میرے مکان کی دیوار آپ کی دیوار سے ملتی ہے۔" خاصی وسیع و عریض توند والے ایک اجنبی صاحب ہار ڈالتے ہوئے بولے۔

"مینوں بھی تسی اپنا سیوک ہی سمجھو مہاراج۔ تہاڈا چھوٹا بھرا (بھائی) ساڈی چھت تے اُتھے پتنگ انڈا انداسی۔ بڑا ہی سوہنا منڈا اسی" (بڑا ہی اچھا لڑکا ہے)

ایک اور عجیب الخلقت صاحب نے کہا۔

" بھائی صاحب ــــــ ہمیں تو آپ بھول ہی گئے ۔"، بھاری بھرکم مسز ککڑ بل ڈوزر کی طرح بھیڑ کو روندتی ہوئی ہماری طرف آئیں ۔"، آپ نے تو ہمارے آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔ بس ایک بار تب آئے تھے جب اس مکان کو کرایہ پر لینے کی بات چل رہی تھی اور آپ نے ہم سے مکان کا پتہ پوچھا تھا۔ کل میں نے بھنڈی اور کدو کی بھاجی بنائی تھی یہ سوچ کر کر آپ بہت پسند کرتے ہوں گے۔ مگر آپ تو آئے ہی نہیں"۔

جواب میں ہم کہنا چاہتے تھے کہ نہ تو ہمیں بھنڈی اور کدو پسند ہیں اور نہ آپ نے ہمیں دعوت دی تھی لیکن ہم سے پہلے ایک اور صاحب بول پڑے۔

"بہن جی ــــــ یہ اخبار والے آدمی ہیں۔ بھلا انہیں فرصت کہاں ــــــ مگر خیر ہمارے ہاں ٹنڈے پکے ہیں۔ میری گھر والی آج ہی شام کو آپ کے ہاں ایک کٹوری بھیج دے گی۔ آپ تو اکیلے ہی رہتے ہیں نا ــــ کھانا بنانے کی بڑی دقت رہتی ہوگی..."

پہلی بار معلوم ہوا کہ گلی کے کافی لوگ ہمیں جانتے تھے اور دہلی میں چاہے ہم کتنے ہی گمنام ہوں مگر اپنی گلی میں خاصے مقبول تھے اور یہ کہ ہم بلاوجہ ہی اپنی گمنامی کو لے کر احساس کمتری میں مبتلا ہوتے رہتے تھے۔

بتاشے بانٹ کر ہاروں سے لدے پھندے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھتے ہیں کہ ہمارا کمرہ پہلے ہی ہاؤس فل ہو چکا ہے ایک صاحب نے بھیڑ میں سے نکل کر اپنا تعارف کرایا اور بولے۔

" ہم شری ہنومان جی کے مندر سے آئے ہیں یہ پرتی ندھی منڈل لے کر۔ آپ کا ابھینندن کرنے کے لئے۔ آپ نے گھر میں ٹیلیفون لگوا کر اس گلی کی شوبھا بڑھا دی ہے"، انہوں نے ہمارے ماتھے پر تلک لگاتے ہوئے کہا۔

ہاتھ جوڑ کر ہم نے ان کا ابھینندن سویکار کیا تو انہوں نے ایک بڑا سا ہار ہمارے نئے نویلے ٹیلی فون کے گلے میں ڈال دیا۔ اور پھر اس کو بھی ایک ٹیکا لگا دیا پچیس افراد

www.taemeernews.com


پر مشتمل اس وفد کو چائے اور ٹھنڈے کے ساتھ سموسے کھلا کر اور اپنا ٹیلی فون نمبر بتا کر ابھی ہم نے رخصت ہی کیا تھا کہ نواحی کالونی کی مسجد کی منتظمہ کمیٹی کا وفد ملاقات کے لئے آگیا۔

"بھئی ماشاء اللہ ـــــ مبارک ہو۔ ملت کے نوجوانوں کو اس طرح ترقی کرتے دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ سنا ہے آج ہی لگا ہے؟" ایک بزرگ نورانی صورت نے پوچھا۔

"جی ہاں آج ہی صبح کرنٹ ریلیز ہوا ہے۔"

"بھئی واہ۔ اللہ مبارک کرے۔ ایس ٹی ڈی بھی لی ہے؟"

"جی ہاں ـــــ"

"بھئی سبحان اللہ ـــــ اچھا دیکھئے آج رات کو بعد نماز عشاء مسجد میں ضرور تشریف لائیے گا۔ تنزانیہ کے ایک مولانا تشریف لائے ہیں۔ ان کے وعظ سے متاثر ہو کر افریقہ کے لاکھوں نوجوان دنیا چھوڑ کر دین کی طرف آگئے ہیں۔۔۔۔۔۔" بزرگوار نے کہا لیکن ابھی وہ بات بھی پوری نہ کر پائے تھے کہ ایک ماڈرن نوجوان نسوانی صورت کمرے میں آدھمکا۔

"یہ پاپا نے بھیجا ہے انکل ـــ" لڑکے نے مٹھائی کا ایک ڈبہ ہمارے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "ٹیلی فون لگنے کی خوشی میں۔"

"ارے بھائی اس کی کیا ضرورت تھی ـــــ واپس لے جائیے اور اپنے پاپا سے کہیئے کہ۔۔۔۔۔"

"نہیں نہیں انکل ـــــ رکھ لیجئے یہ ہماری ہی دوکان کی ہے۔"

اچھی بات ہے وہاں رکھ دیجئے۔" ہم نے اس طرف اشارہ کر دیا جہاں تلک دھاری ٹیلی فون رکھا تھا۔ لڑکے نے ڈبہ رکھ کر ٹیلی فون کو نمسکار کیا اور پھر ریسیور اٹھا کر بولا ـــ

"انکل ذرا دکان پر ٹیلی فون کر لوں؟"

ہماری اجازت ملنے سے پہلے ہی اس نے ڈائل پر نمبر ملانے شروع کر دیئے اور ۱۵ منٹ تک اپنے پاپا سے کھویا، پنیر اور چینی کے اسٹاک اور کاریگروں کے پیمنٹ کے بارے میں نہ جانے کیا کیا باتیں کرنے کے بعد بولا ـــ "انکل پلیز

www.taemeernews.com


اگر پاپا کا فون آیا کرے تو ہمارے گھر سے کسی کو بلا دیا کیجئے۔ ہم پاس ہی دوسری گلی کے آخری مکان میں رہتے ہیں۔"

لڑکے کی ہدایت پر اس کے مکان کا نوٹ کرنے کے بعد ہم بزرگ نورانی صورت اور ان کے رفقاء کی جانب متوجہ ہوئے مگر ابھی ہم نے ان کے لئے بازار سے چائے اور حلوا لانے کا آرڈر دیا ہی تھا کہ محلہ سدھار کمیٹی کے صدر اور سکریٹری نے قدم رنجہ فرما کر ہماری عزت افزائی کر دی۔ صدر صاحب نے نہ صرف ہمیں مبارک باد دی بلکہ کمیٹی کے دو درجن اراکین کی فہرست بھی مع نام، پتہ ہماری سہولت کے لئے دیدی تاکہ اگر ان کی کوئی کال ہمارے ٹیلی فون پر آئے تو ہم انہیں بروقت اور بہ آسانی ان کے گھروں سے بلا سکیں۔

"اچھا برادر عزیز — اب ہم چلتے ہیں۔" ان کے جاتے ہی بزرگ نورانی صورت بھی اٹھ گئے مگر جاتے جاتے پھر رک گئے۔

"ارے بھئی معاف کرنا۔ ذرا ایک ٹیلی فون کرنا ہے"۔

"ضرور ضرور ——"

اپنے لڑکے سے بات کرنی ہے ——" انہوں نے ریسیور اٹھا کر نمبر گھماتے ہوئے کہا۔ "ان دنوں دوبئی میں رہتا ہے"

"دوبئی میں؟" ہم بڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔

"ہاں ماشاءاللہ وہاں ٹیلی فون کے محکمہ میں ہے۔"

اس کے بعد بزرگوار دوبئی میں اپنے بیٹے کو بیس منٹ تک نصیحتیں اور نیک آدمی بننے کی تلقین کرتے رہے۔

"بھئی واہ" بات مکمل کرنے کے بعد انہوں نے کہا۔ "ایس ٹی ڈی بھی کیا مزے کی چیز ہے۔ پلک جھپکتے میں آدمی ہزاروں میل دور بات کر لیتا ہے۔ یہ سب قیامت کے ہی تو آثار ہیں۔ غیر تنزانیہ کے مولانا کو یاد رکھنا ہر خوردار۔۔۔۔۔"

انہوں نے ہمیں نیم مردہ چھوڑ کر جاتے ہوئے کہا۔

جب سے ہمارا ٹیلی فون خراب ہوا ہے تب سے اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہم بس ایک ہی بات سوچ رہے ہیں اور یہ کہ خدا دشمن کے بھی گھر میں ٹیلی فون نہ

www.taemeernews.com


لگوا۔ یے نہ ٹیلی فون ہوگا نہ خراب ہوگا۔ اور نہ وہ مصیبتیں جھیلنی پڑیں گی جوان دنوں ہمیں جھیلنی پڑ رہی ہیں۔

ہمیں یاد ہے اور اگر یہ کالم باقاعدگی سے پڑھ رہے ہیں تو آپ کو بھی یاد ہوگا کہ جب ہمارے گھر میں نیا نیا ٹیلی فون لگا تھا تو ہم کتنے خوش تھے کالونی والوں نے ہمیں ٹیلی فون لگنے کی خوشی میں مٹھائی کھلائی۔ ہار پہنائے یہاں تک کہ علاقہ کی محلہ سدھار کمیٹی غیر رجسٹرڈ کا پروپیگنڈہ سکریٹری تک بنا دیا۔

مالک مکان اتنا خوش ہوا کہ اس نے کرائے میں سو روپے بڑھا دیئے گلی میں ہمارے گھر کے آگے بلاناغہ ہر ہفتے جھاڑو لگانے والی مہترانی کو ایسی دلی مسرت ہوئی کہ اس نے ہمارے گھر کا ریٹ ۱۰ سے بڑھا کر ۱۵ روپے کر دیا۔ دودھ والا بھی اس قدر شاداں و فرحاں ہوا کہ اس نے دودھ میں فی لیٹر ۵۰ پیسے اور ۱۰ املی لیٹر پانی کا اضافہ کر دیا۔ اور تو اور مندر مسجد، گوردواروں مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کے لئے چندہ کرنے والوں کو بھی نہ جانے کیسے معلوم ہوگیا کہ ہمارا اسٹیٹس بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی ہمارا ریٹ بڑھا دیا۔

خود ہمارا بھی یہ حال تھا کہ ہر ایک کو پکڑ پکڑ کر اپنا ٹیلی فون نمبر بتاتے پھر رہے تھے۔ جب بھی کوئی دوست یا شناسا ملتا اور علیک سلیک کے بعد ہماری خیریت دریافت کرتا تو ہمارا جواب عموماً یہ ہوتا۔

"جی خدا کا فضل ہے۔ آپ کی دعا سے سب بخیریت ہیں۔ خالہ کے لڑکے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ ماموں کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے، بھانجہ امتحان میں فیل ہوگیا ہے۔ بڑے بھائی کے خسر کا دماغ چل گیا ہے۔ چھوٹے بھائی کی شادی ہونے والی ہے۔ مالک مکان نے مکان خالی کرانے کے لئے مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ باقی سب خیریت ہے اور ہاں گھر میں ٹیلی فون بھی لگ گیا ہے ڈبل ٹو زیرو نائن فور ٹو فائیو۔ نمبر نوٹ کر لیجئے۔"

اس مہم کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ کچھ ہی دنوں بعد ہمارے گھر میں دوستوں اور ہمسایوں کی بھیڑ رہنے لگی۔ کبھی کوئی گوئل صاحب تشریف لے آتے اور یہ کہتے ہوئے کہ اس طرف سے گزر رہا تھا سوچا ذرا آپ کا حال چال بھی پوچھ لوں ناگپور سے ٹرنک

www.taemeernews.com

کال ملاکر ایک ٹرک سنترے بھیجنے کا آرڈر دے جاتے۔ ان کے جاتے ہی کوئی چوپڑا صاحب آدھمکتے اور ہمیں مفت میں ٹیلی فون کرنے کے لئے آنے والوں سے بچنے کے گر بتاتے بتاتے ٹیلی فون پر چاؤڑی بازار میں اپنے بھتیجہ کی خیریت نجف گڑھ میں سمینٹ کے ڈیلر سے اسٹاک کی پوزیشن، ریلوے اسٹیشن انکوائری سے ترن سکھیا میل کے چلنے کا صحیح وقت اور دوردرشن کے رسیپشن روم سے اتوار کی فیچر فلم کا نام پوچھ جاتے۔

ان سب لوگوں کے علاوہ مسٹر کلکرنی بھی اپنے پانچوں بچوں سمیت ہم سے ملک کی سیاست کے تازہ ترین حالات پوچھنے کے لئے آتے رہتے ہیں۔ ان کے آنے پر جب ہم انہیں کمپوچیا میں پول پوٹ کی واپسی اور نکاراگوا کی صنعتی پالیسی سے ہندوستان اور خلیجی ملکوں کے باہمی تجارتی روابط پر پڑنے والے اثرات کے بارے میں بتا رہے ہوتے تو ان کے صاحبزادے ہمارے ٹیلی فون سے شوق فرماتے رہتے۔ کوئی انٹ شنٹ نمبر ملاکر دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے والے کو اس کے رشتہ دار کا آئی ٹی او پر ایکسیڈنٹ کروا کر تنگ کرتا تو دوسرا ڈن سیون فور ملاکر وقت بتانے والی عورت کی نقل اتارتا رہتا۔ ہم اسے کہتے کہ بیٹے تمہارے ہاتھ میں تو گھڑی بندھی ہے اس میں وقت کیوں نہیں دیکھ لیتے تو وہ یہ کہہ کر لاجواب کر دیتا کہ انکل میری گھڑی دس سیکنڈ آگے رہتی ہے۔

اس پر مسٹر کلکرنی انہیں ڈانٹ دیتے اور پھر ٹیلی فون پر اپنے دفتر کے کسی ساتھی کا نمبر ملاکر اس سے آدھے گھنٹے تک دفتر کی پالیٹکس پر تبادلۂ خیال کرتے رہتے۔ اس کے بعد وہ پھر میری طرف متوجہ ہوتے اور کہتے۔

"معاف کیجئے بھائی صاحب میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ کمپوچیا میں لوٹ پوٹ کی واپسی کے بعد ——"

"لوٹ پوٹ نہیں پول پوٹ" ہم انہیں یاد دلاتے۔

"ہاں ہاں وہی۔ پوٹ پول ——"

"پول پوٹ جناب پول پوٹ"

"جی ہاں میرا مطلب وہی ہے ٹول پول"

"پول پوٹ!!" ہم چلاتے

www.taemeernews.com



"ارے صاحب کہہ تو رہا ہوں۔ پوپ لوٹ ......"

"چلئے۔ چلئے۔ آگے کہئے ۔۔۔" ہم ہتھیار ڈال دیتے۔

"میرا کہنا یہ ہے کہ لوٹ پ لول کی نکاراگوا میں واپسی کا کمپوچیا اور خلیجی ملکوں کے باہمی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اس لئے ہمیں ....."

"کلکرنی صاحب پلیز۔ ہمارے حال پر رحم کیجئے۔ پول پوٹ نکاراگوا سے نہیں کمپوچیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ہم ہند اور خلیجی ملکوں کے تعلقات پر بحث کر رہے تھے۔ کمپوچیا اور خلیجی ملکوں کے تعلقات پر نہیں۔"

کوئی بات نہیں بھائی صاحب۔ کل ہم اسی موضوع پر مزید گفتگو کریں گے۔ اب اجازت دیجئے۔ خدا حافظ۔"

غرض اس طرح ہمارا ٹیلی فون ہم سے زیادہ ہمارے دوستوں اور پڑوسیوں کے کام آتا رہا اور ان سب کی خاطر تواضع سے ہم عاجز آ گئے۔ یہاں تک کہ مقروض بھی ہو گئے۔ پھر بھی ہم خوش تھے کہ چلو کوئی بات نہیں ٹیلی فون کی ہی بدولت سہی چار آدمی عزت تو کرتے ہیں۔

مگر جب سے یہ آلۂ نامراد خراب ہوا ہے تب سے پڑوسیوں کا ہی نہیں ہمارا بھی برا حال ہے نہ دن کو سو سکتے ہیں نہ رات کو جاگ سکتے ہیں۔

ٹیلی فون خراب ہونے کی ہزار صورتیں ہوتی ہیں اور ہمیں ان سبھی کا ایک ایک کر کے سامنا کرنا پڑا ہے۔

سب سے پہلی خرابی ہمارے ٹیلی فون میں یہ آئی کہ اس پر دوسری طرف سے غلط کالیں آنے لگیں۔ عام لوگ ایسی صورت میں "ساری رانگ نمبر" یا "ہشت رانگ نمبر" کہہ کر رسیور رکھ دیا کرتے ہیں۔ لیکن ہماری ٹریجڈی یہ ہے کہ ہم نے عام آدمی بننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کئی ایسے موقعوں پر جبکہ عام آدمی آسانی سے بچ جاتا ہے ہم پوری طرح پھنس جاتے ہیں۔

مثلاً ایک صبح ہم اپنے جوتوں پر پالش کر کے دفتر روانہ ہونے والے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی ہم نے رسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی "ہلو۔ مقصود بھائی میں خلیل خاں بول رہا ہوں پھاٹک حبش خاں سے۔ آپ کی بیوی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے

www.taemeernews.com



جلدی آئیے اسپتال لے جانا پڑے گا۔،،

"کیسے؟" ہم نے پوچھا۔

"بیوی کو جناب۔،،

"اوہ! اچھا میں آتا ہوں" یہ کہتے ہوئے ہم نے ایک چھلانگ لگائی جلدی جلدی کرتے کی جگہ کرتا اور پاجامے کی جگہ پاجامہ پہنا دائیں پیر کا جوتا بدقت تمام بائیں پیر میں اور بائیں پیر کا جوتا دائیں پیر میں چڑھایا اور بھاگم بھاگ زینہ اتر کر گھر سے باہر چل دیئے مگر یاد آیا رومال تو رہ ہی گیا ہے چنانچہ پلٹے، زینہ چڑھ کر گھر میں پہونچے، بڑی مشکل سے رومال ڈھونڈا اور چل دیئے۔ مگر اس مرتبہ خیال آیا کہ گھر کو تالہ لگانا بھول گئے ہیں چنانچہ پھر پلٹے۔ تالہ لگایا، واپس چلے مگر بائیں پیر کے دائیں جوتے نے زینہ پر نہ جانے کیا حرکت کی کہ پاؤں پھسلا اور ٹخنہ مڑ گیا۔

پڑوسیوں کی مدد سے چیختے چلاتے شدو پہلوان کے ہاں پیر سیدھا کرانے گئے اور وہاں پٹی بندھوانے کے بعد پلٹے تب اچانک یاد آیا کہ نہ تو ہمارا نام مقصود ہے اور نہ ہی ہماری کوئی بیوی ہے۔ تب کہیں جان میں جان آئی۔

ان غلط کالوں کا سلسلہ رات کو بھی جاری رہنے لگا۔ کبھی کبھی رات کو تین بجے گھنٹی بجنے لگتی اور ریسیور اٹھاتے تو مسز چھابڑا کے شوہر مسٹر چھابڑا کی طرف سے ہدایت ملتی کہ مسز چھابڑا کی پہلی ڈلیوری ہے لہٰذا مع آلات فوراً آجائیں۔ کبھی کوئی رات ایک بجے جگا کر پوچھتا رہا پوچھتی) کہ اکیلے ہو کیا؟ بھیجوں کسی کو؟ نتیجہ یہ ہوتا کہ ساری رات بے چینی میں گزرتی۔

ٹیلی فون نگم سے شکایت کی تو اس کا مستعد کارندہ ٹھیک ایک ہفتے بعد آکر نہ جانے کیا کر گیا کہ پہلے سے بھی زیادہ غلط کالیں آنے لگیں۔ مجبوراً ایک مستری کو ذاتی خرچ پر بلایا تو اس بندۂ نیک بخت نے وہ لاجواب حل نکالا کہ گھنٹی ہی بند ہوگئی۔

مگر اب ایک نئی خرابی پیدا ہوگئی۔ ہم جو بھی نمبر ملاتے وہ ہمیشہ اینگیج ملتا۔ پہلے تو ہم یہ سمجھتے رہے کہ غالباً سب لوگ مصروف رہنے لگے ہیں۔ مگر جب ایسے سرکاری دفتروں کے فون بھی مصروف رہنے لگے ہیں جہاں کام کو حرام سمجھا جاتا ہے تو ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ آخر جب ہم نے خود اپنا نمبر ملایا اور وہ بھی اینگیج ملا تو یقین ہوگیا کہ

www.taemeernews.com


کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے لہٰذا مستری ہذا کو دوبارہ مع سفر خرچ و طعام بلایا اس نے کچھ ایسا کمال دکھایا کہ ہم جو بھی نمبر ملاتے وہ کھٹ سے مل جاتا۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنا نمبر ملایا تو وہ بھی مل گیا۔

"ہلو! ڈبل ٹو زیرو نائن فور ٹو فائیو؟" ہم نے پوچھا۔

"جی ہاں فرمائیے۔" ہمیں اپنی آواز سنائی دی

"ذرا نصرت ظہیر صاحب سے بات کرا دیجئے۔"

"معاف کیجئے وہ تو ٹنڈے لینے بازار گئے ہیں۔ کوئی میسج ہو تو بتائیے۔"

"جی کچھ نہیں۔ مجھے انہی سے بات کرنی ہے"

مگر چند روز بعد پتہ چلا کہ اس مرتبہ ایک نئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اپنے علاوہ ہم جو بھی نمبر ملاتے تھے وہ کسی اور کے نمبر سے مل جاتا ہے۔ ہم بات کرنا چاہتے ہیں مکتبہ برہان والوں سے مگر جواب ملتا حاجی کریم انڈے والوں کی طرف سے نمبر ملاتے جماعت اسلامی کا مگر ریسیور اٹھا لیتے آر ایس ایس والے۔

اسی طرح پرگتی میدان میں مفت دکھائی جانے والی فلموں کے بارے میں پوچھتے تو کملا مارکیٹ تھانہ کا ایس ایچ او بتانے لگتا کہ آج انارکلی، چمپا کلی، نوری سلمیٰ، سیتا اور گیتا کو دعوت عیش دینے پر گرفتار کر کے ان کے گاہکوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس دفعہ مستری ہذا صاحب کی خدمات حاصل کیں تو یہ خوبی پیدا ہوئی کہ ہماری کالیں تو ٹھیک جانے لگیں مگر دوسروں کی آنا بند ہو گئیں۔ تنگ آ کر پھر ٹیلی فون ٹھیک کرایا تو دوسروں کی کالیں آنے لگیں مگر ہماری بند ہو گئیں۔ چنانچہ پھر مرمت کرانی پڑی مگر اس دفعہ گھنٹی کی آواز ہلکی پڑ گئی۔ گھنٹی ٹھیک ہوئی تو ڈائل ٹون مدھم ہو گئی۔ پھر وہ ٹھیک ہوئی تو گھنٹی لگاتار بجنے کا عیب پیدا ہو گیا۔ اس سے نجات ملی تو لائن پر صرف کھٹ پٹ پھٹ پھٹ سنائی دینے لگی آخر میں یہ ہوا کہ گھنٹی و ڈائل ٹون بھی بند ہو گئی کالوں کا آنا جانا بھی رک گیا جب بھی ہم ریسیور اٹھاتے تو دوسری طرف سے ایک ساتھ بہت سے لوگوں کی گفتگو سنائی دینے لگتی۔

"میں نے کھر بندا سے کہہ دیا ہے۔ وہ شرما اور گپتا کو ساتھ لے کر گوئل سے مل

www.taemeernews.com



لے گا۔"

"مگر اس سے کہنا کہ چوپڑا کا لیہ اور تینیجہ سے بھی بات کرے ورنہ چاؤلہ کھنہ اور مہتہ ناراض ہو جائیں گے اور ہیں کلٹر، مکڑا اور سنیجہ کو بھی ٹینڈر میں شامل کرنا پڑے گا بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ کپور، سبھر وال، لوٹیاں، اگروال اور......"

"ہلو ــــ رشمی ــ میں سنجے بول رہا ہوں"

"تم چپ رہو بھائی ــــ ہاں تو ٹنڈن صاحب میں کہہ رہا تھا کہ سچدیوا نے دتہ سے بات کر کے چوہان کو بتا دیا تھا کہ......"

"رشمی۔ میں سنجے بول رہا ہوں۔"

"ابے، کون ہے بے؟ ــــ ہاں تو پانڈے نے ورما سے کہا کہ جب تک دودھوا۔"

"رشمی سنو۔ کل گولچہ پر ملنا۔"

"ابے ہٹ بیچ میں سے۔ تو جناب گوسوامی نے ماتھر کو ساتھ لے کر ملہوترا سے"

"رشمی میں سنجے بول رہا ہوں۔ کل گولچہ پر۔ تین بجے۔ زخمی عورت کے ٹکٹ لے لئے ہیں میں نے......"

"ہلو ٹنڈن جی......"

"ہلو رشمی......"

"ہلو مشرا جی......"

"ہلو رشمی......"

"ابے تو، ریسیور رکھتا ہے یا نہیں......"

اور ہم گھبرا کر ریسیور رکھ دیتے ہیں۔

یہ خرابی کئی دن چلی تو آخر ہم نے ایک دن خود ہی مستقل علاج کر دیا اور ایک ہتھوڑا ڈھونڈ کر ریسیور پر بجا دیا۔

یہ اطلاع ملتے ہی میاں عبدالقدوس دوڑے دوڑے آئے۔ پورا قصہ سن کر ہماری پیٹھ تھپکی اور فلسفیانہ لہجے میں بولے "ٹیلی فون خراب ہونے کی سب سے اچھی صورت وہ ہے جب وہ پوری طرح ڈیڈ ہو۔"

www.taemeernews.com



# کرکٹ اور تاس

ریڈیو پر کرکٹ کی کمنٹری اور ٹیلی ویژن پر اس کے ٹیلی کاسٹ کی بدولت ملک میں روزانہ کام کے کتنے گھنٹے ضائع ہوجاتے ہیں اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے ۔ تاہم یہ دیکھتے ہوئے کہ کروڑوں لوگ اپنا کام دھندہ چھوڑ کر دن بھر چوکوں چھکوں اور وکٹوں کا حساب رکھنے میں لگے رہتے ہیں کہا جاسکتا ہے کہ اندازاً اکئی ارب گھنٹے روزانہ برباد ہوجاتے ہوں گے اور یہ بھی تب ہے جب لاکھوں لوگوں کے سینما وچیتر ہار دیکھنے ، ریلیوں میں حصّہ لینے ، دن رات چائے خانوں میں بیٹھے رہنے اور شاعری کرنے سے کام کے اربوں کھربوں گھنٹے پہلے سے ہی روزانہ ضائع ہوتے چلے آرہے ہیں جو تھوڑے بہت گھنٹے کسی کام کے بچتے بھی ہیں تو انہیں ہمارے نوجوان فٹ بال ، ہاکی ، ٹینس ، کبڈی اور بھاگ دوڑ جیسی خرافات کی نذر کر دیتے ہیں ۔

چنانچہ کبھی کبھی تو ہم یہ سوچ کر حیران ہوتے رہتے ہیں کہ آخر یہ ملک چل کیسے رہا ہے ۔ اور یہ جو ہم بازار سے جب چاہے میدہ ، انڈا ، صابن تیل ، نمک اور سگریٹ وغیرہ خرید لاتے ہیں تو آخر یہ سب بنا کون رہا ہے ؟ کام کے کن گھنٹوں میں یہ سب پیداوار ہو رہی ہے ؟ ۔

خیر بات کرکٹ کی ہو رہی تھی ۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک ایسے کھیل پر جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے اور جس کے اصول کامن سینس کے قطعی خلاف ہیں اس پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے ۔

www.taemeernews.com



سب سے پہلی خلاف عقل بلکہ ظالمانہ حرکت تو اس کھیل میں یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی جو سر سے پیر تک پٹیوں میں بندھا رہتا ہے اسے ایک دو نہیں پورے گیارہ آدمی بھرے میدان میں گھیرے رہتے ہیں۔ اور اس بے چارے کو صرف ایک موٹے سے ڈنڈے سے ان سب کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے اصول مساوات کی ایسی دھجیاں شائد ہی کسی اور کھیل میں اڑائی جاتی ہوں گی۔

دوسری احمقانہ بات یہ ہے کہ اور کھیلوں میں جہاں تین چار گھنٹوں میں اس پار یا اس پار کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو جاتا ہے، وہاں اس کھیل میں کبھی کبھی پانچ دن لگاتار چھ چھ گھنٹے کھیل کر بھی ہار جیت طے نہیں ہو پاتی۔ بائیس کھلاڑی اور دو امپائر دھوپ میں پسینہ بہاتے رہتے ہیں۔ پوری قوم دن رات کھیل کے رخ پر بحث کرتی اور رنوں کا حساب لگاتی رہتی ہے اور آخر میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ صاحب میچ تو ڈرا ہو گیا۔

حامیان کرکٹ کہتے ہیں کہ میچ کا بلا نتیجہ ختم ہونا بھی ایک نتیجہ ہے۔ ایسے لوگوں پر ہم ترس کھانے کے علاوہ کوئی تبصرہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا وہ ہمارے تبصرہ نہ کرنے کو ہی تبصرہ سمجھیں۔

کرکٹ کے قاعدے اور ضابطے بھی عجیب و غریب ہیں۔ مثال کے طور پر بولنگ کا وہ ضابطہ دیکھئے جس کے تحت بولر وکٹ حاصل ہوتا ہے اگر بولر بلے باز کو کلین بولڈ کر دے یعنی اس کی گیند سے بلے باز کا وکٹ گر جائے یا وہ خود ہی کیچ پکڑ لے تو اسے ایک وکٹ کا کریڈٹ دینا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن اگر اس گیند پر بلے باز شاٹ جمائے اور فیلڈر یا وکٹ کیپر کے ہاتھوں کیچ ہونے کے بعد آؤٹ ہو تب بولر کے کھاتے میں اس وکٹ کو جوڑنا کہاں کی دانشمندی ہے یعنی شاٹ تو لگا یا بلے باز نے، کیچ پکڑنے کے لئے جان کی بازی لگائی فیلڈر نے اور کریڈٹ لیا بولر نے۔ یہ بھلا کہاں کا انصاف ہے؟

یہی ایل بی ڈبلیو کا معاملہ ہے۔ ایل بی ڈبلیو کا مطلب ہے لیگ بی فور وکٹ یعنی وکٹ کے آگے پاؤں! اب آپ ہی بتائیے وکٹ کے آگے بلے باز اپنا پاؤں نہیں رکھے گا تو کیا سر رکھے گا۔ اور کیا اسے ایل بی ڈبلیو سے بچنے کے لئے سر کے بل

www.taemeernews.com



کھڑے ہو کر بیٹنگ کرنے کی اجازت مل سکتی ہے ؟

رنوں کا قاعدہ دیکھئے ۔ اگر ایک شاٹ پر چار رن بنیں تو اسے چوکا اور چھ بنیں تو چھکا کہتے ہیں لیکن اگر ایک ، دو ، تین یا پانچ رن بنیں تو انہیں اکّا ، دکّی ، تکّی اور پنجہ کوئی نہیں کہتا ۔!

آؤٹ ہونے کا معاملہ بھی عجیب ہے ۔ ایک اننگز میں ٹیم کے یکے بعد دیگرے ۱۱ کھلاڑی بلے بازی کرتے ہیں ۔ لیکن دسویں کے آؤٹ ہوتے ہی پوری ٹیم کو آؤٹ ڈکلیئر کر دیا جاتا ہے ۔ بظاہر یہ آپ کو ایک معمولی اعتراض معلوم ہوگا لیکن ذرا اس کھلاڑی کے دل اور دماغ کی حالت کا اندازہ کیجئے جس نے ۹۹ رن بنا رکھے ہوں اور صرف اپنے ساتھی کے آؤٹ ہونے کی وجہ سے سینچری سے محروم رہ گیا ہو ۔ (مفصل تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شفیق الرحمٰن صاحب کا مضمون "ننانوے ناٹ آؤٹ") ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ گیارہویں ناٹ آؤٹ کھلاڑی کو آخر بلے بازی کیوں نہیں کرنے دی جاتی ۔

پھر یہ ٹاس بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا آخر اس کی ضرورت کیا ہے کہ میچ شروع ہونے سے پہلے دونوں ٹیموں کے کپتان سکہ لے کر میدان میں آئیں اور یہ فیصلہ کریں کہ پہلے کون بلے بازی کرے گا سوال یہ ہے کہ کسی ٹیم کے پہلے بلے بازی کرنے یا نہ کرنے سے فرق ہی کیا پڑتا ہے اگر ٹاس سے میچ کے نتیجہ پر کوئی اثر ہوا کرتا تو میچ صرف ٹاس جیتنے والی ٹیم ہی جیتا کرتی جب کہ کرکٹ کی ٹیم گواہ ہے کہ ٹاس ہارنے والی ٹیمیں بھی متعدد مرتبہ جیت چکی ہیں ۔ اس لئے سیدھا سا قاعدہ بنایا جا سکتا ہے کہ میزبان ٹیم پہلے بلے بازی کرے اور مہمان ٹیم فیلڈنگ ۔

ٹاس کا فائدہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب میچ ڈرا ہو گیا ہو ۔ اور آخر میں ٹاس کے ذریعہ ہار جیت کا فیصلہ کر لیا جائے ۔

میاں عبدالقدوس کا کہنا ہے کہ اگر ایسا ٹاس میچ سے پہلے کر لیا جائے تو زیادہ اچھا ہے دونوں ٹیموں کے کپتان میدان میں آئیں ، سکہ اچھال کر ہار جیت کا فیصلہ کریں اور خوشی خوشی گھر چلے جائیں پانچ دن تک اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کرنے سے کیا فائدہ ۔؟

www.taemeernews.com



کرکٹ کے ساتھ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ جتنا یہ کھیل کے میدان پر ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ میدان کے باہر ہوتا ہے۔ میدان پر تو رن بنانے کے لئے دو ہی کھلاڑی دوڑتے ہیں مگر میدان سے باہر باقی قوم بھی ان کے ساتھ دوڑتی رہتی ہے۔ جہاں جایئے جدھر دیکھئے ہر شخص اسی فکر میں غلطاں ملتا ہے کہ سری کانت کی سینچری بنی یا نہیں بنی۔ اظہر الدین کے ۲۵ رن پورے ہو گئے کہ نہیں، ارشد ایوب نے کوئی وکٹ لیا یا نہیں۔

جیسے ہی کرکٹ کا کوئی میچ شروع ہوتا ہے، پورے ملک کا مزاج بدل جاتا ہے وہ لوگ بھی جنہیں یہ نہیں معلوم کہ مڈ آن اور مڈ آف میں کیا فرق ہوتا ہے ٹرانزسٹر ریڈیو میں سر گھسائے بیٹھے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دفاتر میں کام آدھا رہ جاتا ہے۔ ملازمین الگ ٹولیوں میں، میچ کی تازہ ترین صورت حال پر بحث کرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں باہر کھڑی پبلک کو پریشان ہونا چاہیئے مگر نہیں۔ باہر دیکھئے تو پبلک بھی کان سے پاکٹ ٹرانزسٹر لگائے ملتی ہے۔

بس اسٹاپ پر بھی یہی حال ہوتا ہے۔ وہاں کھڑی بھیڑ میں سے کسی ایک نے بھی پاکٹ ٹرانزسٹر لے رکھا ہے تو باقی سب اسے گھیر کر کھڑے ہو جائیں گے۔ ایسے میں اگر آپ کسی سے پوچھ لیں کہ بھائی صاحب منگول پوری کون سی بس جائے گی اور وہ جواب دے کہ تین سو سترہ تو آپ کو شاہدرہ پہونچ کر ہی یہ احساس ہو پائیگا کہ ان حضرت نے جو بتایا تھا وہ بس کا نمبر نہیں، میچ کا تازہ ترین اسکور تھا!۔

مسافروں سے کھچا کھچ بھری بسوں میں بھی آپ دیکھیں گے کہ لوگ جان ہتھیلی کی بجائے فٹ بورڈ پر رکھے باہر لٹکے ہوئے ہیں، مگر بس کے اندر آنے سے زیادہ یہ جاننے کے لئے فکر مند ہیں کہ چلتی بس کے اندر اٹھنے والا مسافروں کا اچانک شور سری کانت کے چوکے کے لئے ہے یا چھکے کے لئے؟

راستے میں کوئی دوست عرصے کے بعد ملتا ہے یا گھر میں کوئی مہمان آتا ہے تو آپ کی خیریت معلوم کرنے کی بجائے اس کی دلچسپی میچ کا تازہ ترین اسکور جاننے میں ہوتی ہے۔ آپ دفتر کے لئے لیٹ ہو گئے ہیں اور کان سے ٹرانزسٹر لگائے بڑی تیزی سے قدم اٹھائے ہوئے دفتر کی طرف جا رہے ہیں کہ اچانک کوئی آپ کا راستہ روک کر

www.taemeernews.com



کھڑا ہو جائے گا۔ اور میچ کا اسکور پوچھنے لگے گا۔ آپ اسے یہ بتا کر آگے بڑھنا چاہیں گے کہ دو سو رن پورے ہو گئے ہیں، مگر وہ آپ کو پھر روک لے گا۔

"کتنے وکٹ پر؟" وہ پوچھے گا۔

"پانچ پر ——"

"تو کیا اظہر الدین بھی آؤٹ؟"

"جی نہیں روی شاستری"

"کتنے رن پر؟"

"زیرو پر۔"

"اوہ —— اور اظہر الدین کے ساتھ کون ہے؟"

"کرن مورے۔"

"اسکور کیا ہے دونوں کا"

"اظہر الدین کے ۲۴ اور کرن مورے کے پتہ نہیں ——"

"اوہ —— اور شاستری کو کس نے آؤٹ کیا۔ ہیڈلی نے؟"

"پتہ نہیں" آپ جھنجھلا کر کہیں گے۔

"اوور کتنے باقی ہیں؟"

"پتہ نہیں ....."

"اور جیتنے کے لئے رن کتنے چاہئیں؟"

"پتہ نہیں۔"

"کمال ہے —— آپ کمنٹری سن رہے ہیں یا لوگوں پر رعب جھاڑنے کے لئے ٹرانزسٹر اٹھائے پھر رہے ہیں —— ہنھ —— لعنت ہے۔"

وہ آپ پر لعنت بھیج کر چلا جائے گا اور آپ؟ آپ پتہ نہیں کیا کریں گے۔ شاید غصے میں گھر واپس چلے جائیں گے۔

یہ سب حالات دیکھ کر ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر حکومت کرکٹ کی کمنٹری پر پابندی کیوں نہیں لگاتی۔ اگر کوئی کرکٹ میچ ہو رہا ہے تو ہوا کرے۔ اگلے روز لوگ اخبار میں اسکور پڑھ لیں گے۔ اس کے لئے کمنٹری نشر کر کے پورے

www.taemeernews.com



ملک کا نظام معطل رکھنے سے حکومت کو کیا ملتا ہے۔

کرکٹ کے موضوع پر ابھی ہمیں اور بھی بہت کچھ کہنا ہے مگر فی الحال یہیں سے اجازت دیجئے۔ کیونکہ سامنے رکھے ہوئے ٹی وی پر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ارشد ایوب نے ایک وکٹ اور لے لیا ہے۔

# مقامی انتخابات

اگر ہم سے کوئی مختلف انتخابات کا "تقابلی مقابلہ" کرنے کو کہے تو ہم فوراً لوک سبھا کے انتخابات پر اسمبلی کے انتخابات کو اسمبلی کے انتخابات پر مقامی انتخابات کو ترجیح دے دیں گے۔ بالکل اسی طرح، جس طرح قومی اخبارات پر مقامی اخباروں کو دیتے ہیں۔

مقامی اخبارات پر قومی اخباروں کو ترجیح نہ دینے کی وجوہ ہم بڑی تفصیل کے ساتھ پہلے بھی ان کالموں میں بیان کر چکے ہیں کہ نہ ان میں تھانے داروں، تحصیلداروں اور دوسرے افسروں کے گھروں میں ہونے والی عقیقہ اور ختنہ کی تقریبات کا آنکھوں دیکھا حال چھپتا ہے، نہ نئے چوکی انچارج کے آنے سے علاقے کے عوام میں خوشی کی لہر دوڑتی دکھائی دیتی ہے، نہ مسلم وقف بورڈ کے نئے چیئرمین کی شان میں کوئی قصیدہ پڑھنے کو ملتا ہے اور نہ ہی فلاں سپلائی افسر کی بدعنوانیوں کی روداد آئندہ شمارے میں ملاحظہ کرنے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔

جہاں تک انتخابات کا تعلق ہے تو ہم چھوٹے پیمانے کے انتخابات کو بڑے

www.taemeernews.com


پیمانے کے انتخابات پر اس لئے فوقیت دیتے ہیں کہ جیسے جیسے انتخابات کا پیمانہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے ووٹر کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ ووٹر یعنی عوام کی جو اہمیت میونسپل کمیٹی کے چناؤ میں ہوتی ہے وہ اسمبلی کے چناؤ میں نہیں ہوتی اور جو اسمبلی کے چناؤ میں ہوتی ہے وہ لوک سبھا کے چناؤ میں نہیں ہوتی۔ اس سے آگے عوام کی پہونچ نہیں ہے۔

اسمبلی یا پارلیمنٹ کا چناؤ لڑنا تو دور رہا لڑنے کے لئے کسی پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنا بھی ایک دشوار گزار مسئلہ ہوتا ہے۔ امیدوار سیاسی پارٹیوں کے دفتروں کے چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ لیکن مقامی چناؤ میں یہ جھنجھٹ نہیں۔ اس میں سیاسی پارٹیاں کامیاب امیدواروں کے چکر لگاتی پھرتی ہیں۔

پارلیمنٹ کے چناؤ میں لڑائی اسمبلی حلقوں کی سطح پر ہوتی ہے۔ اسمبلی کے لڑائی وارڈ اور محلہ کی سطح پر لڑی جاتی ہے۔ لیکن مقامی چناؤ کی لڑائی گھر گھر لڑی جاتی ہے۔ چنانچہ دوران انتخابات کبھی کبھی خانہ جنگی بھی ہو جاتی ہے۔

عوام کے لئے، خاص طور پر ان عوام کے لئے جو بہت زیادہ عوام ہوتے ہیں، پارلیمنٹ اور اسمبلی سے زیادہ میونسپل چناؤ میں حصہ لینا زیادہ مفید رہتا ہے۔ اس لئے کہ جہاں پارلیمنٹ اور اسمبلی کے چناؤ میں عموماً ہار جیت کا فیصلہ ہزاروں کے فرق سے ہوتا ہے وہاں میونسپل چناؤ میں دو چار سو ووٹوں سے پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ چنانچہ اکثر آپ دیکھیں گے کہ اگر کوئی تانگے والا بھی کسی امیدوار کو سلام کر لیتا ہے تو وہ (امیدوار) فوراً تانگہ روک کر نہ صرف اس کی (تانگے والے کی) بلکہ اس کے گھر والوں کی خیریت اور مزاج بھی پوچھنے لگتا ہے ـــــ یہاں تک کہ تانگے والے کے گھر والوں کی تعداد اور ان کی عمریں بھی معلوم کر لیتا ہے جس کے بعد وہ تانگے والے کے گھر والوں کے رشتہ داروں کے پڑوسیوں کی تعداد اور ان کی عمریں اور پھر تانگے والے کے ۔۔۔۔۔۔۔ غرضیکہ وہ آدھے گھنٹے تک اسی طرح اپنے ووٹروں کی تعداد کا حساب لگاتا رہتا ہے اور آخر میں تانگے والے کو نیوی کٹ کا ایک سگریٹ پیش کر کے تمام ووٹ پکے کرتے ہوئے خوشی خوشی کسی دوسرے تانگے والے کی تلاش میں چل دیتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے، پارلیمنٹ یا اسمبلی کے چناؤ میں

www.taemeernews.com



کسی تانگے والے کو یہ عزت مل سکتی ہے ؟

## جیت کا حساب

مقامی انتخابات کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ان میں امیدواروں کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ گنتی میں یہ امیدوار ووٹروں کی کل تعداد سے عموماً کم رہتے ہیں پھر بھی اتنے تو ہوتے ہی ہیں کہ بے چارے ووٹروں کو الجھن میں ڈال سکیں کبھی کبھی تو چناؤ کا فیصلہ خود امیدواروں کے ہی ووٹوں سے ہو جاتا ہے۔

رہی الجھن کی بات تو بس کچھ نہ پوچھئے کہیں کسی حلقے سے صرف ایک نشست کے لئے چناؤ ہوتا ہے تو دوسرے حلقے میں دو دو بلکہ کبھی کبھی تین نشستیں ہوتی ہیں پھر ہر نشست کے لئے امیدواروں کی ایک طویل فہرست اور ان کے عجیب و غریب چناؤ نشان بھی ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو یاد رکھنا پڑتا ہے کہ کتنے ووٹ دینے ہیں۔ کس کس کو دینے ہیں، ان کے چناؤ نشان کیا کیا ہیں وغیرہ وغیرہ بے چارے ووٹر کی ایک ننھی سی جان اور اتنی ساری باتیں یاد رکھنے کے لئے!

چنانچہ اکثر یہ گڑبڑ ہو جاتی ہے کہ اپنا قیمتی ووٹ دے کر کامیاب تو کرانا تھا اونٹ والے حاجی بغلول کو مگر مہر لگا آتا ہے شاہ بہلول کے گھوڑے پر نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ چانس تھا کبوتر والے کا مگر جیت جاتا ہے مرغے والا۔ کئی مرتبہ تو اس ساری گڑبڑ میں ایسا امیدوار بھی کامیاب ہو جاتا ہے جسے سب سے تگڑا امیدوار محض اپنے حریف کے کچھ ووٹ کاٹنے کے لئے اپنے ذاتی خرچ پر کھڑا کرتا ہے۔

ایک دلچسپ بات ان انتخابات میں یہ ہوتی ہے کہ کمزور سے کمزور امیدوار کو بھی اپنی کامیابی کا سو فی صد یقین رہتا ہے۔ چاہے محلے میں کوئی اسے نہ جانتا ہو،

www.taemeernews.com


مگر وہ اپنے ووٹوں کا ایسا منطقی حساب آپ کے سامنے رکھے گا کہ آپ کو بھی اس کی کامیابی کا مکمل یقین ہو جائے گا۔

پچھلے دنوں ہم نے ایک امیدوار سے انٹرویو کرتے ہوئے پوچھا۔

"کہیئے قبلہ۔ چناؤ کیسا چل رہا ہے جیتنے کی کچھ امید ہے؟"

"جیتنا ہارنا تو جناب مقدر کا کھیل ہے مگر اس سیڑھی والے کی ضمانت انشاء اللہ ضرور ضبط کرا دوں گا۔"

"سیڑھی والا؟ اس کی پوزیشن تو سنا ہے بہت مضبوط ہے۔"

"مضبوط کیا خاک ہے؟ جولاہوں کے ووٹ پر اینٹھ رہا ہے۔ مگر اب ان میں بھی پھوٹ پڑ گئی ہے۔ رات نیم تلہ چوک کی میٹنگ میں مختار پہلوان نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس دفعہ نیم تلے کے سارے ووٹ کھجور تلے میں جائیں گے۔ آرچ پلکھن تلے میں بھی میٹنگ تھی۔ انہوں نے بھی یہی کہا ہے۔ شام کو املی والی مسجد میں میٹنگ ہو رہی ہے۔ وہاں بھی آپ دیکھ لینا انشاء اللہ یہی بات ہو گی۔!"

"وہ تو ٹھیک ہے قبلہ، لیکن اس سب سے آپ کے چناؤ پر کیا فرق پڑے گا مجھے تو یہ بتائیے کہ آپ کو کیا امید ہے؟ آپ جیتیں گے یا ہاریں گے؟"

"دیکھئے صاحب۔ جیت تو قبضۂ قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ رہی ہارنے کی بات تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ اپنے سیکٹر میں پانچ ہزار چھ سو ترپن بالغ ووٹ ہیں۔ اب حساب لگا لیجئے ان میں سے لوہاروں کے ووٹ ہیں ڈیڑھ ہزار اس برادری کے سارے ووٹ اپنے ہیں۔ اس لئے کہ میرے بھتیجے کی انڈوں کی دکان انہیں کے علاقے میں ہے۔ پھر میں بھی پچھلے آٹھ سال سے ان کی خدمت کرتا آ رہا ہوں۔ ان کے علاقے میں کوئی چار کی دو کان ایسی نہیں جہاں میں صبح و شام ایک دو مرتبہ نہ بیٹھتا ہوں — لوہاروں کے بعد تیلیوں کو لے لیجئے ان کے بھی کوئی ایک ہزار ووٹ ہوں گے۔ تیلیوں میں سب سے زیادہ اثر حلیم اختر حلیم والے کا ہے جو شادیوں میں سہرے بھی پڑھواتا ہے۔ اسے سارے سہرے منشی کاشف سے میں ہی کہلوا کر دیتا ہوں

www.taemeernews.com


تو سمجھ لیجئے کہ ایک ہزار میں سے سات آٹھ سو ووٹ تو کہیں نہیں گئے۔ یہ سب ملا کر ہو گئے دو ہزار سے اوپر۔ اب آئیے دھوبیوں کی طرف ان کے بھی کوئی پچاس گھر ہیں جن میں ہر گھر سے پانچ ووٹ بھی لگائیں تو ڈھائی سو ووٹ ہو جائیں گے اب چونکہ ہمارے گھر ہیں دو پشتوں سے دھلے ہوئے کپڑے پہننے کا رواج چلا آرہا ہے اس لئے دھوبیوں کا ایک ووٹ بھی باہر نہیں جا سکتا۔ نائیوں کے سو ڈیڑھ سو ووٹ بھی سمجھئے اپنے ہی ہیں کیونکہ میرے گھر کا کوئی بھی آدمی آج تک اس سیکٹر کے باہر حجامت کرانے نہیں گیا ہے۔ خدا بخشے میرے چچا کو فلموں میں کام کرنے کے لئے بمبئی گئے تھے برسوں وہاں رہے مگر مجال ہے جو کسی نائی سے حجامت کرائی ہو۔ پندرہ سال بعد واپس آئے تو پورے صوفی بن چکے تھے!"

"اوہ تو کیا پندرہ سال بعد بھی حجامت نہیں کرائی؟"

"نہیں اب تو درگاہ گدڑی شاہ کے سجادہ نشین ہو گئے ہیں اور تعویز گنڈے لکھ کر خدمت خلق کر رہے ہیں۔ خیر۔ تو کتنے ووٹ ہو گئے ملا کر؟"

"یہی کوئی ڈھائی ہزار" ہم نے انگلیوں پر حساب جوڑ کر بتایا۔

"تین سو ووٹ خاں صاحبوں کے بھی اس بندے کو ملیں گے کیونکہ میرا سگا بھانجہ جو کم بخت اول درجے کا آوارہ ہے ہمیشہ ان ہی کے محلے میں جوا کھیلتا ہے۔ پچیس ووٹ سیدوں کے ہیں۔ وہ بھی میرے خلاف نہیں جا سکتے کیونکہ ان کی زیادہ تر جائیدادوں کے مقدمے جو وکیل لڑ رہا ہے وہ میرے سگے بھتیجے کا دوست ہے! یہ سب ملا کر ہو گئے دو ہزار آٹھ سو پچیس ایک ووٹ میری بیوی کا ہے۔ سو وہ بھی میرے خلاف نہیں جا سکتا ہے اس کے بعد ایک ووٹ میرا اپنا ہے وہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ مجھے ہی ملے گا۔ یہ سب ملا کر ہو جاتے ہیں دو ہزار آٹھ سو ستائیس۔ بس قصہ ختم! اب اگر باقی ووٹ کسی ایک ہی امیدوار کو مل جائیں تب بھی اپنی جیت پکی ہے!"

لیکن جب نتیجہ آیا تو پتہ چلا کہ اس امیدار کو صرف دو ووٹ ملے اور انہیں بھی الیکشن افسر نے ناجائز قرار دے دیا۔ ان میں سے ایک امیدوار کا اپنا تھا اور ایک اس کی بیوی کا! اب سنا ہے اس نے اس فیصلے کے خلاف الیکشن پٹیشن دائر کر دی ہے۔

www.taemeernews.com


# کلکتے کا جو ذکر کیا

ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ہم بیٹھے بٹھائے کلکتہ پہونچ گئے۔ محاورے میں نہیں، سچ مچ!

وزارت زمینی نقل و حمل کی طرف سے حکم ملا کہ اخباری نمائندوں کی ایک ٹیم کلکتہ کی بندرگاہ دکھانے کے لئے لے جائی جارہی ہے اور آپ بھی ٹیم میں شامل ہیں لہٰذا ۱۲ دسمبر کی شام پانچ بجے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۹ پر پہونچ جائیے۔

دہلی کے ٹریفک کا خیال کرتے ہوئے ہم کافی پہلے گھر سے بستر بوریا باندھ کر چل دیئے اور تین بجے ہی مقررہ پلیٹ فارم پر پہونچ گئے جہاں ایک مال گاڑی پہلے سے ہی تیار کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر ہم کافی دیر تک حیران ہوتے رہے مگر پھر ہم نے خود کو سمجھایا کہ میاں اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے سرفیس ٹرانسپورٹ منسٹری کا ٹور ہے مال گاڑی میں نہیں تو کیا راجدھانی ایکسپریس میں لے جائیں گے۔

بس یہی سوچ کر ہم نے ایک قلی کو بلالیا اور اس سے درخواست کی کہ بھائی ہمارا سامان اس مال گاڑی میں چڑھا دو اور ہو سکے تو کوئی اچھی سی بیٹھنے کی جگہ دلا دو تاکہ آرام سے کلکتہ پہونچ جائیں۔ قلی ہمیں حیران ہو کر اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا۔

www.taemeernews.com



تبھی مال گاڑی سیٹی دیئے بغیر چل پڑی۔

ہم ایک ایسے ڈبے کی طرف لپکے جس کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا مگر ڈبے میں کئی بھینسوں کو استراحت فرماتے دیکھ کر پیچھے ہٹ جانا پڑا۔ تبھی ریلوے اسٹیشن کی گھڑی پر نظر پڑی جو چار بجا رہی تھی گھڑی دیکھتے ہی ہمیں سمجھ جانا پڑا کہ چونکہ ہمیں پانچ بجے تک آنے کے لئے کہا گیا ہے لہٰذا ہماری گاڑی یہ نہیں ہو سکتی۔

ابھی ہم پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر یہ سب سوچ ہی رہے تھے کہ انڈین پورٹس ایسوسی ایشن کے پی آر او سردار سرجیت سنگھ جھومتے ہوئے ادھر آ نکلے۔ سردار صاحب سے بات ہوئی تو انہوں نے اپنی ۵۰ فیصد انگریزی پانچ فیصد اردو اور باقی پانچ فیصد پنجابی میں ہمیں تفصیل سے سفر کی نوعیت اور غائت وغیرہ کے بارے میں سمجھایا تب جا کر معلوم ہوا کہ ہماری ٹیم مال گاڑی سے نہیں راجدھانی ایکسپریس سے جائے گی۔

بس صاحب ــــ قصہ مختصر یہ کہ ہم راجدھانی ایکسپریس سے اگلی صبح کلکتہ پہونچ گئے۔ لیکن سچ پوچھئے تو راجدھانی ایکسپریس اور کلکتہ دونوں نے ہمیں مایوس کیا! کلکتہ نے کس طرح مایوس کیا اس کا ذکر بعد میں کریں گے، پہلے یہ سن لیجئے کہ راجدھانی ایکسپریس کا سفر کس لئے مایوس کن ثابت ہوا۔

گاڑی میں بیٹھ کر ہم نے اپنا سامان وغیرہ درست کیا اور اس کے چلنے کا انتظار کرنے لگے۔ روانگی کا وقت سوا پانچ بجے کا تھا لیکن جب سات بجے تک بھی گاڑی نے چلنے کا نام نہیں لیا تو ہمیں تشویش لاحق ہو گئی کہ کہیں سردار سرجیت سنگھ نے غلط گاڑی میں تو نہیں بیٹھا دیا ہے چنانچہ ہم نے کھڑکی کے دھندلے شیشوں سے باہر جھانکنے کی کوشش کی مگر ان سے کچھ نہ دکھائی دے سکا۔ آخر سامنے بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے پوچھنا پڑا۔ کیوں جناب گاڑی کب چلے گی۔

وہ صاحب سوال سنتے ہی ایسے گھورنے لگے کہ ہمیں میاں عبدالقدوس یاد آ گئے جب وہ گھورتے گھورتے تھک گئے تو لگ بھگ ڈانٹتے ہوئے بولے ــ "بھائی صاحب گاڑی اس وقت .. اکلومیٹر کی رفتار سے دوڑ رہی ہے اور ٹونڈلہ آنے والا ہے۔!"

یہ دیکھ کر ہمیں بڑی مایوسی ہوئی کہ ٹرین نہ صرف لائٹ پروف، واٹر پروف اور

www.taemeernews.com



ساؤنڈ پروف تھی بلکہ شاک پروف بھی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ مایوسی تب ہوئی جب ٹونڈلہ آیا اور گاڑی وہاں رکے بغیر گزر گئی۔ ہم اٹھارہ گھنٹوں تک ڈبے میں بند پڑے رہے مگر راستے میں کسی اسٹیشن پر اتر کر چہل قدمی کرنے کی ہماری خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ہم نے دیکھا کہ ٹرین ہر جگہ رک جاتی تھی لیکن اسٹیشن پر نہیں ٹھہرتی تھی۔ چند اسٹیشنوں پر رکی بھی تو اس وقت ہم سوئے ہوئے تھے۔

اب سونے کا بھی احوال سن لیجئے جیسے ہی ہم سونے کے لئے لیٹے گاڑی کو نہ جانے کیا جوش آیا کہ اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف اچھلنے لگی اس وقت سردار سرجیت سنگھ اپنی سیٹ پر لیٹے ہوئے لہک لہک کر "گڈی جاندی اے چھلانگاں ماردی مینوں یاد آئے میرے یار دی ــــ" گا رہے تھے اور ہم یہ سوچ سوچ کر دہلے جا رہے تھے کہ شاید گاڑی کا ایک آدھ پہیہ اپنی جگہ سے کھسک گیا ہے اور اب ہم کچھ ہی دیر میں سفر کلکتہ کی بجائے سفر آخرت پر روانہ ہو جانے والے ہیں۔

سر فیس ٹرانسپورٹ منسٹری کے پی آر او اے این شرما جی نے ہمیں سمجھایا کہ رات کو گاڑی کی رفتار بڑھ جاتی ہے اس لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایک اور صاحب نے کہا کہ گاڑی چھپرا بہار کی طرف جا رہی ہے اس لئے اس کا ہلنا قدرتی ہے۔ مگر ہمارا خیال تھا کہ یا تو کوئی پہیہ ڈھیلا ہے یا پھر ریل کی پٹڑی میں گڑھے ہیں۔

رات بھر ہم آیت الکرسی اور سورۂ فاتحہ پڑھتے رہے۔ کبھی کبھار نیند آئی بھی تو دو چار منٹ کے لئے۔ صبح زندہ سلامت اٹھ کر حساب لگایا تو پایا کہ ہم نے رات کی نیند پچیس قسطوں میں پوری کی تھی۔

گاڑی ٹھیک وقت پر ہوڑہ اسٹیشن پر پہونچ گئی لیکن سچ مانئے ان اٹھارہ گھنٹوں میں ہمیں ایک مرتبہ بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ ریل کا سفر کر رہے ہیں۔ نہ راستے میں سیٹ حاصل کرنے کے لئے آپا دھاپی ہوئی، نہ کھڑکی سے چائے گرم، پوری گرم کی سریلی تانیں سنائی دیں، نہ ڈبے میں کوئی مونگ پھلی اور ریوڑی کرارہی بیچنے آیا، نہ کسی فقیر نے گا کر "دو گز کفن کا ٹکڑا تیرا لباس ہوگا" یا "گزرا ہوا زمانہ آتا نہیں دوبارہ حافظ خدا تمہارا" سنایا!

آپ ہی بتائیے۔ ہندستانی ریل میں یہ سب نہ ہو تو ریل کے سفر کا کیا فائدہ؟

www.taemeernews.com


آدمی ہوائی جہاز سے نہ چلا جائے ؟

دوسرے دن ہوڑہ اسٹیشن کے اندر پلیٹ فارم کے پاس ہی ٹیکسیاں اور گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ کلکتہ کا یہ ہمارا پہلا سفر نہیں تھا لیکن اسٹیشن پر یہ انتظام ہمیں پہلی مرتبہ دکھائی دیا جس کی داد ہم ہوڑہ برج سے بذریعہ کار گزرنے کے بعد اس وقت تک دیتے رہے جب تک ایک ساتھی رپورٹر نے یہ نہیں بتا دیا کہ میاں اب ہم ہوڑہ اسٹیشن سے باہر آچکے ہیں۔ اور کلکتہ میں داخل ہو گئے ہیں !

اور بس، اس کے بعد ہم ہر طرف آنکھیں پھاڑ کر کلکتہ دیکھتے رہے۔

جیسا کہ ہم نے کہا کلکتہ ہم اس سے پہلے بھی آچکے تھے لیکن اس مرتبہ کلکتہ آنے کے دو خاص مقصد تھے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ہم سمندر دیکھنا چاہتے تھے۔ (پہلا مقصد بعد میں بتائیں گے۔) قارئین کرام۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگرچہ ہم کلکتہ کے علاوہ بمبئی اور مدراس کا بھی سفر کر چکے ہیں مگر سمندر ہم نے آج تک نہیں دیکھا جس کی وجہ یہ تھی کہ اتفاق سے ان تینوں بندرگاہی شہروں کا سفر ہمیں محدود وقت کے لئے نہایت مصروفیت کے عالم میں کرنا پڑا تھا۔ اس مرتبہ ہمارا خیال تھا کہ سفر چونکہ سرکاری نوعیت کا ہے اور تمام تر سہولتیں مہیا رہیں گی اس لئے سمندر کی خوب سیر کرنے کا موقع ملے گا۔ انڈین پورٹس ایسوسی ایشن کے سردار سرجیت سنگھ نے ہمیں تسلی دی کہ ٹور کے آخری دن ہلدیا گودی دیکھنے کا پروگرام ہے اس کے بعد ہگلی ڈاک میں یقیناً سمندر دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔

ہم بے تابی سے ٹور کے آخری دن کا انتظار کرتے رہے مگر جب وہ دن آیا تو پتہ چلا کہ سردار صاحب چونکہ پہلی مرتبہ کلکتہ آئے تھے اس لئے ان سے جگہوں کے نام بتانے میں غلطی ہو گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ سمندر ہگلی ڈاک میں نہیں بلکہ ہلدیا کے قریب بنایا گیا تھا اور یہ کہ ہگلی ڈاک میں تو صرف ہگلی ندی بہتی ہے !

چنانچہ ہم نے کلکتہ پورٹ ٹرسٹ کے پی آر او مسٹر تیجندر داس سے دست بستہ التجا کی کہ خدارا ہمیں سمندر دکھا دیجئے مگر انہوں نے نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہہ کر تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ سمندر کلکتہ سے براستہ سڑک ایک سو بیس اور براستہ پانی ایک سو ساٹھ کلومیٹر دور پڑتا ہے۔ اور دہلی کے لئے ٹرین کی روانگی میں صرف

www.taemeernews.com



ایک گھنٹہ باقی رہ گیا ہے۔!

"ہمیں مایوس دیکھ کر مسٹر داس پوچھنے لگے۔" اک بات بولن نوس رات بابو آپ سمندر کس لئے دیکھن؟" (ایک بات کہوں نفرت بھائی آپ سمندر کس لئے دیکھنا چاہتے ہیں؟)

"کس لئے؟ ارے صاحب اس لئے کہ ہم نے سمندر آج تک نہیں دیکھا ہے!"

"فلم میں بھی نہیں؟"

"نہیں خیر — فلم میں تو بارہا دیکھا ہے"

"بس تو اتنا پوریشان کس لئے ہوتے ہیں آپ؟"

اس لئے کہ سمندر نے بھی ہمیں نہیں دیکھا ہے!"

"اوہ! یہ تو گومبھیر شومشیا ہے" (اوہ یہ تو گمبھیر سمیا ہے) مسٹر داس نے ہمارا کندھا تھپتھپا کر اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا اور رخصت ہو گئے۔

تو صاحبان یوں ہم کلکتہ سے ناکام و نامراد واپس آگئے اور سمندر نہ دیکھنے کی مایوسی اس قدر بڑھی کہ کے ایس داس کے ہاں سے رس گلے خریدنے بھی یاد نہ رہے!

تاہم اس لحاظ سے یہ سفر خاصا مفید رہا کہ ایک کروڑ سے زائد آبادی والے اس شہر کو ہمیں اس مرتبہ کافی قریب اور گہرائی سے دیکھنے کا موقع ملا اب اگر کوئی ہم سے ایک جملے میں اس شہر کی تعریف کرنے کے لئے کہے تو ہم کہیں گے کہ کلکتہ آبادیوں اور آزادیوں کا شہر ہے!

آبادیوں کا اس لئے کہ اس شہر میں ہر طرف آبادی ہی آبادی ہے لوگ ہی لوگ ہیں اس شہر کا تصور آپ اس بس سے کر سکتے ہیں جس کے پائدان پر چھت پر اور بونٹ پر ہی نہیں مڈگارڈ اور سائلنسر پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے ہوں۔

اور آزادیوں کا اس لئے کہ اس شہر میں ہر بات کی آزادی ہے۔ اس معاملے میں کلکتہ دہلی سے بھی بازی لے گیا ہے۔ یہاں کے لوگ کس قدر آزادی پسند ہیں۔ اس کا اندازہ آپ شہر کی سڑکوں سے بہ آسانی لگا سکتے ہیں۔ دہلی میں سڑکوں پر قدم قدم پر ٹریفک کی پابندیاں ہیں۔ کسی چوراہے پر آپ دائیں نہیں مڑ سکتے۔ کسی پر بائیں نہیں جا سکتے۔ کہیں آپ کو اپنی گاڑی ٹھیک لین میں رکھنی ہوگی کہیں رکنا ہوگا کہیں

www.taemeernews.com



چلتا ہوگا مگر کلکتہ والے اس معاملے آزاد ہیں۔ آپ چاہیں تو اپنی گاڑی کسی بھی لین میں ڈال سکتے ہیں ہری بتی پر رک سکتے ہیں، لال بتی پر چل سکتے ہیں (پیلی بتی عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتی) چوراہوں پر دائیں اور بائیں ہی نہیں سیدھے بھی مڑ سکتے ہیں!

چورنگی ہو یا پارک اسٹریٹ بیشتر سڑکوں پر آپ کو یہ دکھائی دے گا کہ ٹرک کا راستہ ایک بس نے روک رکھا ہے۔ بس کے آگے ایک کار کھڑی ہوئی ہے، کار کے راستے میں ایک اسکوٹر پھنسا ہوا ہے۔ اسکوٹر کے آگے ٹرام اٹکی ہوئی ہے اور ٹرام کے آگے دو بنگالی بابو بھنے چنے کھاتے ہوئے رابندر سدن میں گزشتہ رات ہونے والے رقص کے پروگرام کے فنی نقائص پر بحث کر رہے ہیں۔

دراصل کلکتے کے لوگ کلچر کے اس قدر شیدائی ہیں کہ وہاں کلچر کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ نہ ایگری کلچر نہ ہارٹی کلچر ایگری کلچر تو خیر دہلی میں بھی نہیں ہے لیکن کلکتہ میں تو ہارٹی کلچر بھی نہیں ہے۔ اگرچہ ہندستان کا سب سے اہم بوٹینیکل گارڈن (بقول میاں عبدالقدوس کے پیڑ پودوں کا چڑیا گھر) یہیں واقع ہے لیکن اس کے باہر یہاں پیڑ پودوں کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

ایسا لگتا ہے کہ پیڑ پودوں کی ساری کمی اس گارڈن میں واقع برگد کے اس درخت نے پوری کر دی ہے جسے دنیا کا سب سے بڑے گھیرے والا برگد سمجھا جاتا ہے — اور جس کا تنا عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہے۔ اب یہ برگدوں کی ایک بڑے جھنڈ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ جس کی تمام شاخیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔

کلکتہ میں عمارتوں سے جو جگہ باقی بچی ہے اس پر بھی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد جو جگہ بچ رہی تھی اس پر بریگیڈ پریڈ میدان اور سالٹ لیک اسٹیڈیم واقع ہیں جن کے آگے علی الترتیب ہمارے رام لیلا میدان اور جواہر لال نہرو اسٹیڈیم بالکل بچے معلوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا پیڑ لگیں تو کہاں لگیں؟ سنا ہے کلکتہ کارپوریشن اب اس مقصد کے لئے کچھ زمین باہر سے درآمد کرنے کی سوچ رہی ہے۔

چار روز تک گھومتے گھومتے ہم نے اس شہر میں اتنے بجرے جہاز دیکھے کہ کچھ نہ پوچھئے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہاں ہر محلے میں ایک جہاز کھڑا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ سمندر کہیں نہیں ہے سمندر یہاں سے ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جہاز دیکھتے

www.taemeernews.com



دیکھتے ہمارا یہ حال ہو گیا کہ کئی ساکت و جامد عمارتیں بھی دور سے جہاز کا ڈیک نظر آنے لگیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ہم ایک بڑے جہاز پر چڑھنے لگے تو پتہ چلا کہ وہ عمارت ہے!

اسی طرح ایک پانچ منزلہ عمارت کو میونسپل کارپوریشن کا صدر دفتر سمجھ کر زینے میں چڑھے تو معلوم ہوا کہ وہ ایک پرانا اور ناکارہ جہاز تھا!

پیڑوں کے لئے کلکتہ میں کوئی جگہ نہیں ہاں کہیں کہیں پودے ضرور نظر آجاتے ہیں۔ وہ بھی انگریزوں کے زمانے کی سفید عمارتوں کی دیواروں پر جن کا رنگ اب کالا پڑ چکا ہے۔ قدیم برطانوی طرز کی ان عمارتوں سے کلکتہ بھرا پڑا ہے۔ ہمارے ایک ساتھی نے ان عمارتوں کو دیکھ کر کہا۔ کیا کسی کو ان پر سفیدی کرانے کا خیال نہیں آتا؟

ہم نے اسے بتایا کہ بھائی اگر ان سب پر سفیدی کرادی گئی تو کلکتہ سفید پوش عمارتوں کا خوبصورت شہر بن جائے گا۔ اور اگر کلکتہ خوبصورت شہر بن گیا تو یہاں باہر سے اور زیادہ لوگ رہنے کے لئے آجائیں گے، اگر لوگ آگئے تو آبادی اور بڑھ جائے گی۔ اگر آبادی بڑھ گئی تو یہ شہر بدصورت ہو جائے گا۔ اگر شہر بدصورت ہو گیا تو پھر سفیدی کرانی پڑے گی۔ اور اگر۔۔۔۔

ہمارے ساتھی نے ہمیں "ہشت" کہہ کر خاموش کر دیا اور کھڑکی کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ گردن گھمائی تو رات کے اندھیرے میں کار کے شیشے سے بائیں جانب بقۂ نور بنے ہوئے وکٹوریہ میموریل کا حسن دیکھ کر ہم پر غشی طاری ہو گئی۔ یہ عمارت فلپس کی فلڈ لائٹس میں اتنی ہی پرشکوہ اور دل آویز نظر آرہی تھی۔ جتنا چودھویں کی رات کا تاج محل!

کلکتہ کی سب سے آرام دہ چیز ہے یہاں کی ٹرامیں! کسی کیڈلیک کی طرح بڑے آرام سے چلتی ہوئی یہ بجلی کی ٹرامیں کلکتہ کے ایک خاصے بڑے حصے پر رواں دواں نظر آتی ہیں۔ رفتار ان کی اتنی تیز ہوتی ہے کہ مقررہ اسٹاپ آنے سے پہلے ضرورت پڑنے پر راستے میں اتر کر کسی پنواڑی سے سگریٹ یا پان بندھوا کر بھی اسے آپ دوبارہ پکڑ سکتے ہیں! کرایہ اس قدر کم کہ الامان والحفیظ! کم سے کم پینتیس پیسے اور

www.taemeernews.com


ازیادہ سے زیادہ پچاس پیسے! اور کنڈکٹر اتنا شریف کہ خدا کی پناہ۔ پینتیس پیسے آپ کی جیب میں نہ ہوں تب بھی آپ کو منزل پر پہونچا دے گا بلکہ راستے میں آپ کو کھینی (تمباکو اور چونا) بھی آفر کرے گا!

ان ٹراموں میں سفر کرتے ہوئے ہمیں ڈی ٹی سی کی بہت یاد آئی۔ کئی بار تو دل اتنا مغموم ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آگئے اور ہم گنگنانے لگے۔ غم دیئے مستقل، کتنا نازک تھا دل۔۔۔۔۔۔

ایک روز دل میں آیا کہ اردو اخباروں کا حال بھی دیکھ لیں۔ چنانچہ ہم روزنامہ آزاد ہند کے دفتر پہونچ گئے، جسے کلکتہ کا سب سے بڑا اردو روزنامہ سمجھا جاتا ہے! مگر دفتر دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی! نہ زینے میں جا بجا پان کی پیک کے چھینٹے نظر آئے، نہ صحن میں کوئی پہلوان نما تہمد پوش ایڈیٹر موڑھے پر بیٹھا قسط وار ایڈیٹوریل ڈکٹیٹ کراتا دکھائی دیا۔ نہ سہمے ہوئے نوجوان نیوز ڈیسک پر سر جھکائے قلم گھستے بندھوا مزدوروں کی حالت میں ملے!۔۔۔ ایک صاف ستھرا کھلا کھلا سا دفتر تھا جس میں ہر سب ایڈیٹر اپنی الگ میز پر کام میں مصروف تھا اور سب کام سکون سے ہو رہا تھا نیور ایڈیٹر منیر نیازی صاحب نے جو بڑے وضعدار کم گو اور زود نویس صحافی ہیں دفتر کے ساتھیوں سے ملایا۔ ایک محترمہ سے بھی یہ کہتے ہوئے تعارف کرایا کہ وہ کلکتہ میں اردو کی واحد خاتون صحافی ہیں۔ (افسوس ان کا نام یاد نہیں رہا)

اخبار کے چیف ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی سے بھی ملاقات ہوئی جو تہمد کے بجائے سفاری سوٹ میں تھے اور موڑھے کے بجائے گھومنے والی کرسی پر بیٹھے تھے وہ سبزی منڈی کے کمیشن ایجنٹوں کے بجائے ادیبوں کے سے شستہ اور سائستہ لہجے میں ہمیں کافی دیر تک کلکتہ کے سیاسی و سماجی حالات کے بارے میں بتاتے رہے کہ کلکتہ کی ایک تہائی آبادی فٹ پاتھوں پر رہتی ہے۔ اس شہر کا مستقبل بے حد تاریک ہے وغیرہ وغیرہ۔

کلکتہ کی ہندی بولی کا بھی جواب نہیں۔ ہر شخص اس زبان کو یہاں گول گول لہجے میں بولتا ہے۔ پیش کو واؤ "و" سے بدلنے کا شوق یہاں عام ہے۔ چنانچہ رس گلے کو روشوگولا کہتے ہیں۔ بندھو کو بوندھو (کبھی کبھی بھوندو) کلکتہ کو "کول کٹا" ہلدی

www.taemeernews.com


کو ہولدی اور ہلدیہ کو ہولدیہ کہا جاتا ہے۔

زبر اور زیر کو کھینچ دیتے ہیں تو 'ی' اور 'آ' کو زیر و زبر کر دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ دوران ڈنر کلکتہ پورٹ ٹرسٹ کے مسٹر تیجیندر داس نے جنہیں ان کے بنگالی ساتھی مسٹر دَس بولتے تھے ہم سے پوچھا ـــــ "کارڈ لیجئے گا؟" ہم نے یہ سوچ کر کہ شاید وہ اپنا وزیٹنگ کارڈ دینا چاہتے ہیں کہہ دیا۔ "ضرور ضرور" اور انہوں نے کرڈ (دہی) کی پلیٹ ہماری طرف بڑھا دی ایک دن دریائے ہگلی میں ایک بجرے پر سیر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا "لانچ پر لانچ آ رہا ہے" ہم بڑی مشکل سے سمجھ پائے کہ ہمارا لنچ ایک لانچ کے ذریعہ بجرے پر ہی لایا جا رہا تھا۔

کہنے کو ابھی بہت کچھ باقی ہے مگر کیا کریں اسپیس کم ہے لہٰذا اس قصے کو یہیں تمام سمجھئے۔!

# اردو کا دوسرا المیہ

اردو کا ایک المیہ تو یہ ہے کہ وہ عام آدمی کی روزی روٹی سے نہیں جڑ پائی ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم جیسوں نے اپنی روزی روٹی اردو سے جوڑ لی ہے جنہیں صحیح اردو لکھنا اور بولنا تو دور رہا پڑھنا تک ٹھیک سے نہیں آتا۔ دوسروں کی تو خیر کیا کہیں، اپنی کہتے ہیں کہ ـــــ ملاحظہ کو ملاخ طا خوشخبری کو خوش خبری لاین حل کو لائے خل اور جیب کے گریباں کو جے بی ب گریباں پڑھنے کی غلطی عام لوگوں سے بھی سرزد ہوتی ہے مگر ہم سیدھے سادے

www.taemeernews.com



جملوں میں بھی الجھ جاتے ہیں۔

مثلاً ایک مرتبہ ہم نے غلطی سے جنوبی افریقہ کی کسی کونسل کو نسل پرست قرار دینے کی خبر پڑھ لی۔ طبیعت چونکہ بڑی متجسس واقع ہوئی ہے اس لئے ہفتوں ہر ملنے جلنے والے سے پوچھتے رہے کہ بھئی کونسل پرست تو سمجھ میں آتا ہے کہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کونسلوں اور انجمنوں کو زیادہ پسند کرتا ہو (جیسے ادارہ ترقی انجمن پسند مصنفین کے اراکین) لیکن یہ کونسل کو نسل پرست کیا بلا ہوتی ہے؟ ایک صاحب نے جواب دیا کہ اس کا مطلب ہے ڈبل کونسل پرست، تب کہیں جاکر ہمیں قرار آیا۔

ایک تیسرا المیہ بھی ہے اردو کا، اور وہ یہ کہ اس بے چاری نے اب تک کا سارا سفر کاتبوں کے کندھوں پر سوار ہوکر طے کیا ہے۔ (ویسے اب حالت الٹی ہے اور اوّل الذکر موٴخر الذکر کے کندھوں پر پیر تسمہ پا بنے بیٹھے ہیں) جمالیاتی ذوق میں مبتلا حساس طبع اردو قارئین کی بدولت اردو میں ٹائپ رواج نہیں پاسکا اور سر سے لے کر پیر تک اس کا جوڑ جوڑ کاتبوں کی گرفت میں آگیا چنانچہ ص اور س کے جوڑ میں کتنے دندانے ہوں گے کن دو لفظوں کو الگ الگ یا ملا کر لکھا جائے، یہ سب طے کرنا کاتب حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں تک کہ دال اور واؤ کی ساخت بھی ان ہی کے موڈ پر منحصر ہے۔ چاہیں تو دال کو واؤ بنا دیں اور چاہیں تو واؤ کو دال کر دیں۔

چنانچہ بحر او قیانوس کو بحر دقیانوس داور اکو دادرا اور وادی کشمیر کو دادی کشمیر پڑھنے کی غلطی ہم سے اکثر ہوتی رہتی ہے۔ یہ بھی ہم آج تک نہیں سمجھ پائے ہیں کہ غالب کے "صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا" والے شعر کا پہلا مصرعہ کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ" ہے یا کادِ کادِ سخت جانی ہائے ..........." ہے اور تو اور داغ جیسے سہل فہم شاعر کے متعدد اشعار بھی ہم عدو اور عدد کی مماثلت کی وجہ سے اب تک نہیں سمجھ پائے ہیں۔

بچپن میں سینما کے پوسٹروں پر لکھے ہوئے لفظ آجشکو سے ہم یہ معنی لیتے تھے کہ یہ فلم بہت مزے دار ہے۔ اپنے دوستوں کو بھی مشورہ دیتے رہتے تھے کہ جس فلم

www.taemeernews.com


کے پوسٹر پر "آجشبکو" لکھا ہو وہ ضرور دیکھنی چاہیئے۔ چنانچہ ہم ان دنوں ہر "آجشبکو" فلم دیکھ ڈالتے تھے نتیجتاً شہر کا کوئی سینما گھر ایسا نہیں بچتا تھا جس کی فلم ہماری دیکھی ہوئی نہ ہو۔

ان دنوں گھر میں جب بھی بزرگوں کی کسی محفل میں تحریک ترک موالات کا ذکر چھڑتا تو پڑوس کی ایک بڑی بی ہم سے یہی سوال کرتیں کہ بیٹا یہ ترک موالات کیوں مارتا تھا؟ ایک مرتبہ ہم کسی مریض کے لئے حکیم صاحب کے خط شکستہ میں لکھے ہوئے نسخہ کے مطابق عطار سے بنفشہ، وانہہ، الایچی، خرید نے گئے تو اس نے ایک پڑیا میں بنفشہ و دانہ الائچی باندھ کر پکڑا دی جس نے مریض پر ذرا بھی اثر نہ کیا اور عطار سے جھگڑا ہوا سو الگ۔

ایک مرتبہ ہم اخبار کی سرخی میں "لیڈی کانفرنس" پڑھ کر پریشان ہو گئے اور کئی دن تک سوچتے رہے کہ عورتوں کا پیٹی کوٹ سنا تھا یہاں تک کہ اوور کوٹ بھی سنا تھا۔ مگر یہ لیڈی کانفرنس کیا بلا ہے؟ درجن بھر ڈکشنریاں دیکھ ڈالیں۔ مگر صاحب نفرنس کہیں نہیں ملا۔

لیکن ان سے بھی بڑا مسئلہ اس زبان کے لفظوں کو سمجھنے اور اصطلاحات وضع کرنے کا ہے۔ خیر سے اردو میں عربی کے لفظ بھی ہیں فارسی کے بھی ترکی کے بھی اور انگریزی کے بھی۔ چنانچہ جو بھی ان زبانوں میں تھوڑی شد بد رکھتا ہے اپنا اپنا ڈنڈا لے کر اس پر چڑھ دوڑتا ہے اور اس پر اپنی گرامر اور قاعدے تھوپنے لگتا ہے۔

ہم آج تک نہیں سمجھ پائے کہ حقائق کو اگر ہم ہمیشہ حقہ کی جمع اور محقق کو اس کا فاعل (یعنی حقہ پینے والا) سمجھتے رہے ہیں تو آخر اس میں غلط کیا ہے؟۔ اسی طرح شکار کرنے والے کو شاکر اور شکار ہونے والے کو مشکور کہنے میں کیا قباحت ہے؟ ایک شخص نے آپ کو احسان کر کے دبا لیا ہے تو آپ اس کے شکار ہی تو ہوئے ایک دفعہ ایک صاحب کو اس رعایت سے ہم نے کہہ دیا کہ جناب میں آپ کا مشکور ہوں۔ یہ سنتے ہی وہ بگڑ گئے اور کہنے لگے۔ صحیح لفظ عربی کے قاعدے سے متشکر ہے۔ اس لئے یہ کہیں کہ میں آپ کا متشکر ہوں۔ ہم نے انہیں لاکھ سمجھایا کہ حضور قبلہ متشکر اسے کہتے ہیں جسے شکر کی بیماری ہو۔ مگر وہ نہیں مانے۔

www.taemeernews.com


ہمارے دوست میاں عبدالقدوس کا ایک نوکر بہت کاہل ہے اور بہرا بھی چنانچہ انہوں نے اس کا نام بحرالکاہل رکھ چھوڑا ہے دفتر میں ایک صاحب نے جو عربی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر گئے تھے۔ ہم سے ایک دن پوچھا کہ میاں یہ بحرالکاہل کہاں ہے؟ اس پر ہم نے انہیں میاں عبدالقدوس کا پتہ بتا دیا تو وہ اتنے ناراض ہوئے کہ ایک عربی داں کو پچڑ لائے جس نے نہ صرف بحرالکاہل کی بے حرمتی کرنے پر ہمیں قابل گردن زدنی قرار دے دیا بلکہ اس کالم کے نام کو زبر کے ساتھ تحتَ اللفظ نہ لکھنے پر مقدمہ ٹھوکنے کی بھی دھمکی دے دی مگر جب ہم نے اسے مناظرہ کی دعوت دی اور یہ کہتے ہوئے کہ عربی کی گرامر بھی نقائص سے پاک نہیں اس سے یہ سوال کیا کہ جاہل سے جہالت کی طرح لفظ کاہل سے کہالت کیوں نہیں بنتا تو اپنے سر کو دیر تک پیٹنے کے بعد اس پر اپنے پاؤں رکھ کر سرپٹ بھاگ گیا۔

مناظرہ میں اس شاندار کامیابی کے بعد سے دفتر میں ہماری کافی عزت ہونے لگی ہے اور وہ ہمارے سامنے عربی بولتے ہوئے گھبرانے لگے ہیں چنانچہ جب کبھی دفتر میں ہمیں کوئی شخص گھبراتا ہوا نظر آتا ہے تو ہم فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ اسے ضرور عربی بولنے کی حاجت ہو رہی ہے۔

# اردو کے اخبار

اخبار نکالنا جتنا ہمارے ملک میں آسان ہے اتنا شاید نیا کے تختہ پر کہیں نہیں ہوگا۔ سب سے آسان کام بھی اس ملک میں اخبار نکالنا ہے۔ اور اخباروں میں

www.taemeernews.com



بھی سب سے آسان کام ہے اردو اخبار نکالنا آپ دنیا کا کوئی بھی پیشہ اپنائیں کوئی بھی دھندا کریں۔ کچھ نہ کچھ محنت ضرور کرنی پڑے گی۔ یہاں تک کہ اگر آپ مونگ پھلی کی ریڑھی لگانا چاہیں تب بھی آپ کو ہزار پانسو روپے کی سرمایہ کاری کرنا ہوگی ریڑھی بنوانے کے لئے منت کش بڑھئی ہونا پڑے گا۔ میونسپل کمیٹی سے اجازت لینی پڑے گی، حوالدار کی مٹھی گرم کرنی ہوگی تب کہیں جاکر آپ کو "مونگ پھلی کراری ہے" جیسا بے ضرر اور سپاٹ جملہ بلند آواز میں بولنے کی اجازت ملے گی۔

لیکن اخبار خاص طور سے اردو اخبار نکالنے کے لئے کچھ بھی درکار نہیں ہے۔ مجسٹریٹ کے ہاں ڈکلیریشن کی درخواست داخل کیجئے اور چپ چاپ گھر بیٹھ جایئے۔

مکان کی مرمت کے لئے سیمنٹ کی منظوری ملنے میں ضرور ایک سال لگ جائے گا مگر اخبار کے ڈکلیریشن کی درخواست ایک ہفتہ یا زیادہ سے زیادہ دو ہفتوں میں منظور ہوجائے گی اور لطف کی بات یہ ہے کہ تعلیمی لیاقت اور تجربہ وغیرہ کی بھی کوئی شرط نہیں ہے۔ دفتر میں چپراسی کا اعزاز پانے کے لئے بھی کم از کم میٹریکولیٹ ہونا ضروری ہے۔ مگر اخبار کا پرنٹر پبلشر پروپرائٹر اور ایڈیٹر بننے کے لئے دائیں یا بائیں ہاتھ میں ایک انگوٹھا ہونا کافی ہے۔ پس جس کے پاس بھی ایک عدد انگوٹھا ہے وہ شان سے ایڈیٹر بن سکتا ہے!۔

اوروں کی کیا کہیں۔ خود ہم بھی اپنے شہر عزیز ضلع سہارنپور یوپی میں کئی اخبار ایڈٹ کرکے نام کما چکے ہیں۔ اب آپ ہی سوچئے جب ہمارے جیسا آدمی ـــــ بلکہ صحافی بھی ایڈیٹری کرسکتا ہے تو کون ایسا ہے جو نہیں کرسکتا!

اردو اخبار چلانے کے دو بڑے آسان نسخے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شہر کے تھانیداروں ضلع افسروں موجودہ وسابق ممبران پارلیمنٹ واسمبلی ومیونسپلٹی کے قصیدے ہر ہفتے چھاپتے رہیئے۔ مثلاً

"فلاں تھانیدار کے آتے ہی شہر میں امن چین ہوگیا ہے۔ بدمعاش شہر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں چوریاں بند ہوگئی ہیں۔ لوگ اپنا سامان کھلا چھوڑ کر رہنے لگے ہیں یہاں تک کہ بلیاں بھی چوری چھپے گھر میں گھس کر دودھ پینے سے تائب ہوگئی ہیں ڈاکوؤں

www.taemeernews.com



نے دوسرے شہر کے تھانوں میں پناہ لے لی ہے وغیرہ وغیرہ۔"

یہ قصیدے چھاپتے رہیئے گا تو ہر ہفتے آپ کے پاس اتنی رقم آتی رہے گی کہ کتابت طباعت اور کاغذ کے خرچ کے علاوہ آپ کے تمام خانگی وغیر خانگی اخراجات بھی پورے ہوتے رہیں گے بالفرض محال کسی قصیدے کا نقد جواب نہ آئے تو اگلے ہفتے قصیدہ بے نقط چھاپ دیجئے مثلاً۔

"فلاں تھانے دار کے آتے ہی شہر میں جو امن چین ہو گیا تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔ سارے بدمعاش شہر واپس آ گئے ہیں۔ چوریاں دوگنی رفتار سے شروع ہو گئی ہیں۔ لوگوں نے سامان آخرت باندھ لیا ہے۔ بلیاں کھلے عام دودھ پیتی پھر رہی ہیں۔ باوثوق ذرایع نے ہمارے نمائندہ خاص کو اس تھانے دار کی کالی اور شرمناک کرتوتوں کا کچا چٹھا دے دیا ہے جس کی تفصیل آئندہ شمارے میں پیش کی جائے گی۔"

اگر تھانے دار بے ایمان ہو گا تو رقم سے بھرا موٹا لفافہ اگلا شمارہ چھپنے سے پہلے آپ کے پاس پہونچ جائے گا۔ اور اگر ایماندار ہو گا تو لفافہ بھیجنے کے علاوہ شاندار دعوت بھی دے گا۔ ایماندار افسر کی کرسی کچھ زیادہ ہی خطرے میں رہتی ہے نا! اس لئے!

دوسرا نسخہ اس سے بھی کارآمد اور منافع بخش ہے۔ اس سے نہ صرف دنیا سنورتی ہے بلکہ آخرت بھی سنور جاتی ہے۔ پہلے نسخہ میں آپ کو صرف دولت ملتی ہے جب کہ اس میں شہرت و عزت بھی ہاتھ آتی ہے اور تقدیر امم بنتی ہے سو الگ! یہ نسخہ بھی پہلے نسخہ کی طرح سیدھا اور آسان ہے۔ اس میں آپ کو صرف مذہب و ملت کا چشمہ آنکھوں پر لگانا ہو گا جو آپ کو کسی بھی مذہبی جماعت کی دکان سے بہ آسانی مل جائے گا۔

یہ چشمہ لگاتے ہی آپ کو ہر تصویر کا صرف ایک رخ دکھائی دینے لگے گا۔ آپ کو دکھائی دے گا کہ جس تھانے دار کی آپ نے تعریف یا مذمت کی تھی وہ اپنے مذہب اور فرقہ کے لوگوں سے زیادہ رعایت برتتا ہے۔ ڈاکہ صرف آپ کی ملت کے حقوق پر ڈالا جاتا ہے۔ حکومت جو بھی کرتی ہے وہ آپ کی قوم کے مستقبل کے لئے خطرناک ہوتا ہے اور جب بھی کوئی مخالف آواز کہیں سے ابھرتی ہے تو آپ کا مذہب خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

www.taemeernews.com



یہ چشمہ لگاتے ہی اگر صرف انگوٹھے والے ہوں تو قلم اٹھائیے۔ اور ہوں تو کسی منشی کو چائے پلا کر ایک لمبا ایڈیٹوریل لکھوائیے۔ اس ایڈیٹوریل میں جی بھر کر حکومت کو گالیاں دیجئے، سیکولر لوگوں کو عورتوں کے محاوروں میں کوسئے، اپنے اخبار کو اس انداز میں پیش کیجئے جیسے آپ کی شخصیت بین الاقوامی سیاست کا مرکز و محور ہو، اور یہ کہ اگر آپ کا اخبار بند ہو گیا تو قوم کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔!

ایڈیٹوریل، لکھتے لکھتے جب تھک جائیں تو آخر میں قوسین میں " باقی کل" رکھ کر مسودہ کاتب کے حوالے کیجئے۔ گلی میں نکل کر کسی مالشئے کو آواز دیجئے موڑھے پر بیٹھ کر اس سے سر کی مالش کرائیے اور اس کے بعد آرام سے خراٹے لیتے رہیئے۔ اگلے دن آپ عصر حاضر کے قائد ملت یا حکیم الامت بن چکے ہوں گے۔ اور آپ سوچنے لگیں گے کہ تہمد چھوڑ کر چوڑی دار پاجامہ پہننے کا وقت آگیا ہے!

# مقامی اخبار

اخبار تو سبھی کام کے ہوتے ہیں لیکن مقامی اخباروں کی بات ہی کچھ اور ہے!

جتنی معلومات ان اخباروں سے حاصل ہوتی ہے اتنی آپ کو انڈیا ٹوڈے پڑھ کر بھی حاصل نہیں ہوگی۔ انڈین ایکسپریس ہو یا ٹائمز آف انڈیا کسی بھی بڑے اخبار میں آپ کو نہ تو تھانے داروں۔ انسپکٹروں اور تحصیلداروں کے گھروں میں ہونے والی منڈن اور عقیقہ کی تقریبات کا احوال دل نشیں پڑھنے کو ملے گا، نہ کہیں راؤ مختار علی خان صاحب ایڈوکیٹ کے دادا بننے کی مبارکباد کی خبر دکھائی دے گی نہ حاجی حکیم طاہر

www.taemeernews.com



حسین سابق میونسپل کمشنر کا تیسرا عقد ثانی بخیر و خوبی انجام پانے کی اطلاع ملے گی ، نہ محلہ شاہ مدار میں شاندار شعری نشست کے رات چار بجے تک کامیابی کے ساتھ چلنے اور چائے و پان سے حاضرین کی تواضع پر ختم ہونے کی خبر ملے گی ، نہ حضرت ساحل کھار پاری کے ۱۲۱۴ دیں مترنم شاگرد کی معرکتہ الآرا غزل ترنم سے ملاحظہ کرنے کا شرف حاصل ہوگا ، نہ منشی کاشف کلامی انجمی ماہر کشف و عملیات کا اشتہار برائے تسخیر جنات و دفع بلیات و کتیات پڑھنے اور موکل قبضہ میں کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آئے گا ۔ نہ خواجہ خفقان غفرلہٗ کی زیر تصنیف سوانح " بوریئے سے مصلے تک " کا اشتہار دکھائی دے گا ۔ یہاں تک کہ چیرمین مسلم وقف بورڈ کی اعلاقیادت میں ہونے والے گھپلوں کی تفصیل بھی آئندہ شمارے میں پڑھنے کو نہیں ملے گی ۔

یہی وجہ ہے کہ اگرچہ دفتر کی طرف سے کئی بڑے اخبار روزانہ ہمارے گھر آتے ہیں مگر نہ انہیں ہم پڑھتے ہیں نہ وہ ردی والا جو ہر ماہ یہ اخبار سمیٹ کر ہمیں معقول رقم تھما جاتا ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ چھوٹے مقامی اخبار پڑھنے میں ہی ہم اتنے زیادہ مصروف رہتے ہیں کہ کبھی کبھی تو چترہار بھی مس ہو جاتا ہے ۔

اصل میں بڑے اخبارات پر مقامی اخبارات کو ترجیح دینے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہیں آپ چاہے پڑھئے ہمیشہ تازہ رہتے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ سن ۱۹۵۷ء کے کئی اخبار ابھی تک ہمارے زیر مطالعہ ہیں ۔

ان میں ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ شہر میں ہر طرف گندگی ہے ۔ ہیضہ پھیل رہا ہے ، مچھروں کی بھرمار ہے ، میونسپلٹی سو رہی ہے ، ملیریا پھیلنے کے آثار ہیں وغیرہ وغیرہ یہ اخبار پڑھ کر چند روز قبل ہم شہر کے دورے پر گئے ۔ تو معلوم ہوا کہ ایڈیٹر نے ۳۱ سال بعد کے حالات بھی کس قدر صحت کے ساتھ تحریر کر دیئے تھے ۔ ایڈیٹر کی رپورٹ حرف بحرف صحیح نکلی چنانچہ اخبار میں ایڈیٹر موصوف کا پتہ دیکھ کر ہم ان کی حقیقت نگاری پر مبارکباد دینے کے لئے ان کے گھر گئے ۔ اور دو گھنٹے بعد بڑی نہر کے قبرستان میں فاتحہ پڑھ کر واپس آئے ۔

دوسری خاص بات ان اخباروں کی یہ ہے کہ یہ بے حد مختصر ہوتے ہیں اگرچہ بقیوں کی بیماری ان میں بھی ہوتی ہے ۔ اور بعض اوقات صفحہ ۲ کے اداریہ کا بقیہ

www.taemeernews.com


صفحہ ۱ کے آخری کالم میں جاکر صفحہ ۲ کے دوسرے کالم کی سیر کرتا ہوا صفحہ اول پر پہونچ جاتا ہے۔ تاہم ضخامت عموماً چار صفحات سے زیادہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک اخبار آپ صرف ایک اور کبھی کبھی تو آدھی نشست میں بھی پورا پڑھ سکتے ہیں

ایک مرتبہ اپنے ضلع کا ایک اخبار دیکھ کر ہمارا سینہ فخر سے چوڑا گیا اس سے اخبار کی ایک کاپی ہمارے پاس محفوظ ہے اور ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں دنیا میں اس سے مختصر اخبار نہ کہیں شائع ہوا ہے نہ ہوگا۔ اخبار کا نام ہے "بیدار ہند" اور ضخامت ہے پورا ایک ورق یعنی دو صفحے۔ پہلے صفحے کے نصف بالائی حصے میں اخبار کا نام، جائے پیدائش اور ولدیت کے علاوہ شمارہ نمبر، جلد نمبر قیمت فی شمارہ (۲۵ پیسے) سالانہ چندہ، شش ماہی چندہ، سہ ماہی چندہ اور صرف چندہ کی شرحیں لکھی ہوئی ہیں۔ نیچے کھادی گرام ادیوگ کا اشتہار ہے، ایک کونے میں قارئین کو عید سعید کی پرخلوص مبارک باد دی گئی ہے دوسرے صفحہ پر تازہ حلیم۔ لذیذ سری پائے، خستہ ڈبل روٹی۔ سیخ کباب بنانے والے باکمال ہنرمندوں، سستا لذیذ کھانا پیش کرنے والے اعوذ باللہ ہوٹل اور نعوذ باللہ ٹی اسٹال کے کلاسیفائڈ اشتہارات ہیں اور ایک گوشے میں قارئین کرام سے ایڈیٹر کی یہ گزارش تحریر ہے کہ براہ کرم ہر ماہ پابندی سے شائع ہونے والے "بیدار ہند" کو مزید بہتر بنانے کے لئے اپنی قیمتی آرا سے ضرور نوازیں۔

اس نادر روزگار شمارہ میں غیر اشتہاری مواد کے طور پر صرف علامہ اقبال کا ایک شعر درج ہے۔

جو اخبار کی پیشانی پر کمشنری کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار والی لائن کے اوپر لکھا ہوا ہے۔ شعر ہے۔

چڑیوں کی طرح دانہ پہ گرتا ہے کس لئے
پرواز کچھ بلند کر تو بن سکے عقاب!

(لفظ "عقاب" کے سامنے کاتب نے ایک خونخوار پنجہ کی شکل بنا دی ہے)۔

اب آپ ہی بتائیے۔ کیا مواد کے اعتبار سے اتنا ضخیم اور جسامت، معاف

www.taemeernews.com


کیجئے گا حجم کے اعتبار سے اتنا مختصر اخبار کہیں دیکھا ہے آپ نے؟ جلد ہی یہ شمارہ ہم نیشنل آرکائیوز کے حوالہ کر دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں کیونکہ اسے دیکھتے دیکھتے ہماری کئی قمیضیں تنگ ہو گئی ہیں۔

# ترجمے کے مسائل

عام طور پر تخلیق کو ترجمہ سے بڑا کام مانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مصنف وہ عورت ہے جو ماں بن کر اولاد کو اپنے گوشت پوست اور خون سے تشکیل دیتی ہے۔ جبکہ مترجم وہ مرد ہے جو اس اولاد کی صرف پرورش کرتا ہے۔ گویا عورت ایک تخلیق ہے اور مرد ترجمہ! لیکن ہم اس نظریہ کو قطعی نہیں مانتے۔ بھلا عورت مرد سے برتر کیوں ہو سکتی ہے۔ کسی مذہب اور کسی تہذیب میں بھی عورت کو مرد سے برتر تو کیا اس کے برابر بھی نہیں مانا گیا۔ پھر ہم کیسے مان لیں؟

مگر خیر ـــــ بات چل رہی تھی تخلیق اور ترجمہ کی قارئین ہم اپنے دس سالہ صحافتی تجربہ کے بعد جسے ہم نے بڑی مشکل سے بیس برسوں میں حاصل کیا ہے دثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ترجمہ تخلیق سے زیادہ مشکل اور اہم کام ہے۔ مصنف جب کوئی تخلیق کرتا ہے تو وہ اپنے خیال کے ہر پہلو سے واقف ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کا اپنا خیال ہوتا ہے۔ تخلیق کی زبان لب و لہجہ اور استعارات و محاورات اس کی گھٹی میں پڑے ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس جب مترجم اس کی تخلیق کا ترجمہ کرتا ہے تو نہ خیال

www.taemeernews.com



اس کا اپنا ہوتا ہے نہ زبان اسے تخلیق کی ہی نہیں مصنف کی گہرائی میں بھی جانا پڑتا ہے۔ وہ مصنف کی روح کو ٹٹولتا ہے۔ اس کے لب و لہجہ کو سمجھتا ہے، محاوروں اور استعاروں کے سمندر میں غوطے لگاتا ہے تب کہیں جا کر اس کے ایک پیرا گراف کا ترجمہ کر پاتا ہے۔

ہمیں یاد ہے کہ جب اخبار کے نیوز ڈیسک پر ہم بطور سب ایڈیٹر کام کرتے تھے تو اخبار کی کاپی میں خالی جگہ پر کرنے کے لئے لاہور یا واشنگٹن جیسے کسی بھی دور دراز علاقہ میں تانگہ اور رکشہ کی ٹکر کی خبر چٹکی بجاتے ہی تخلیق کر دیتے تھے۔ اس کے برعکس جب ٹیلی پرنٹر پر آنے والی ویسی ہی کسی خبر کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا پڑتا تھا تو کاتب کو خبر دینے میں گھنٹوں لگ جاتے تھے۔ کئی بار تو یہ بھی ہوا کہ نیوز ایڈیٹر نے ہمیں چھ گھنٹے کی شفٹ میں چار مختصر خبریں ترجمہ کے لئے دیں جن میں سے دو تو خیر شفٹ ختم ہونے سے پہلے ہی ترجمہ ہو گئیں لیکن بقیہ دو کو نپٹانے کے لئے ہمیں مزید ایک شفٹ کے لئے اوور ٹائم پر رکنا پڑا۔

چنانچہ اس طرح پچھلے دس برسوں میں ہم نے سینکڑوں نہیں تو درجنوں خبریں ضرور ترجمہ کی ہوں گی اس وسیع و وقیع تجربہ کے بعد ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ترجمہ خاص طور پر انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا، تخلیق کرنے سے کہیں زیادہ مشکل اور جان مارنے کا کام ہے۔

تاہم گھبرانے کی کوئی بات نہیں اخباروں کے ان سب ایڈیٹروں اور مترجمین کی رہنمائی کے لئے جو اس میدان میں نئے نئے داخل ہوئے ہیں یہاں ہم ترجمہ کو آسان بنانے والے کچھ مفید نکتے اور اپنے شہرہ آفاق ترجموں کے کچھ نمونے پیش کر رہے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف!

نکتہ نمبر ۱۔ جس خبر یا مضمون کا ترجمہ کرنا ہو، پہلے اسے اچھی طرح پڑھ ڈالئے اور یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ اس کا موضوع کیا ہے۔ اگر موضوع آپ کی سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ہے، نہیں تو اسے نیوز ایڈیٹر کو واپس کر کے کوئی اور خبر لے لیجئے۔ یاد رکھئے ترجمہ سے پہلے مضمون کا موضوع سمجھ میں آنا بہت ضروری ہے۔ اب آگے چلئے۔

نکتہ نمبر ۲۔ مضمون کا موضوع سمجھ میں آجائے تو ترجمہ کرنے سے پہلے یہ دیکھ

www.taemeernews.com



لیجئے کہ آپ اس سے متفق بھی ہیں یا نہیں۔ اگر مضمون سے نظریاتی اختلاف ہو تو اس کا ترجمہ ہرگز مت کیجئے۔ لیکن مجبوری ہو تو کوشش کیجئے کہ ترجمہ میں وہ باتیں نہ آئیں جنہیں آپ نہیں مانتے ترجمہ کو پراثر بنانے کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔

مثال: ایران عراق جنگ میں ہم چونکہ ہمیشہ ایران کے حامی رہے ہیں اس لئے ان کی جنگ سے متعلق کیسی بھی خبر کا ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ ایران کو ہرگز ہزیمت نہ ہونے پائے۔ جنگ میں کام آنے والے ایرانی فوجیوں کو ہم نے ہمیشہ "شہید" اور عراق کے سپاہیوں کو ہمیشہ "ہلاک" کیا ہے۔

اسی طرح ہم متوفی ہستیوں میں سے جو مسلمان ہوں انہیں "مرحوم" اور جو نہ ہوں انہیں "آں جہانی" لکھتے ہیں تاکہ فرق واضح رہے۔ انگریزی خبروں میں چونکہ شہید اور ہلاک یا مرحوم اور آں جہانی میں کوئی فرق نہیں ہوتا اس لئے مبتدی مترجم کے لئے محتاط رہنا لازم ہے۔

نکتہ نمبر۳۔ ترجمہ کے دوران اگر کوئی مشکل لفظ آجائے تو اس کے معنی دیکھنے کے لئے لغت کا استعمال مت کیجئے۔ ڈیسک پر بیٹھے ساتھیوں سے اس کے معنی پوچھتے رہیئے اور جب تک لفظ کے معنی سے آپ پوری طرح مطمئن نہ ہو جائیں تب تک نہ تو خود کام کیجئے نہ دوسروں کو کرنے دیجئے۔

مشکل لفظوں کے معنی دوسروں سے پوچھنے کے دو فائدے ہوں گے ایک تو یہ کہ ساتھیوں کی قابلیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ دوسرے اگر ترجمہ غلط ہو گیا تو اس کی ذمہ داری تنہا آپ پر نہیں رہے گی۔ یہ پالیسی کس درجہ کامیاب رہتی ہے اس کا اندازہ ایسے لگا لیجئے کہ ہمارے غلط ترجموں کی وجہ سے اب تک ایک درجن سب ایڈیٹروں کی شامت آچکی ہے بلکہ ان میں سے کئی تو معطل بھی ہو چکے ہیں اور ہم ترقی کر کے کہیں کے کہیں پہونچ گئے ہیں۔

نکتہ نمبر۴۔ ترجمہ عام فہم سادہ اور سلیس ہونا چاہیئے۔

نمونہ کے طور پر ایک خبر کا ترجمہ ملاحظہ کریں۔

"مرکزی وزارت برائے فروغ وسائل انسانی کے تحت نو تشکیل شدہ محکمہ انسداد بے رحمی حیوانات کی ذیلی کمیٹی کی مجلس عاملہ کے نائب صدر کے مشیر خصوصی کے نائب

www.taemeernews.com



ترجمان اعلانے آج اخباری نمائندوں کو بتایا کہ اس محکمہ کا ایک وفد بہت جلد مغربی جرمنی کے دورے پر جائے گا جہاں وہ مغربی جرمنی کی وزارت تحفظ حیوانات کے مرکزی شعبہ کے تحت کام کرنے والے ذیلی محکمہ کی سکریٹری کے مشیروں سے دونوں ملکوں میں مختلف جانوروں کی بولیوں پر کی جانے والی تحقیق میں ہوئی پیش رفت کا جائزہ لینے کے لئے تبادلہ خیال کی کوشش کرے گا۔ امید ہے کہ اس سے دونوں ملکوں کے تعلقات مزید استوار ہوں گے۔

نکتہ نمبر ۵: جملے بہت چھوٹے ہونے چاہئیں تاکہ قارئین بہ آسانی آپ کی بات سمجھ سکے۔

مثال: نکتہ ۴ کے تحت دیا گیا نمونہ ملاحظہ کریں۔

نکتہ نمبر ۶: کسی بھی لفظ کو ترجمہ کئے بغیر نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اس سے ترجمہ میں جان پڑ جاتی ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی مفہوم بھی بدل جاتا ہے تاہم اس کی قطعاً فکر نہ کرنی چاہیئے۔ یونانی مفکر افلاطون کہہ گیا ہے کہ ترجمہ کا حسن، مفہوم کی ادائیگی سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

مثال: کشمیر میں دریائے جہلم کی طغیانی سے جنگل میں لکڑی کے بڑے بڑے سلیپر بہہ جانے کی ایک خبر کا ترجمہ ہم نے یوں کیا تھا۔ "جہلم میں سیلاب آنے سے جنگل میں سوئے ہوئے بہت سے لوگ بہہ کر پاکستان چلے گئے۔"

اسی طرح آگرہ اسٹیشن پر ایک مال گاڑی کے "اسٹیشنری ٹرین" سے ٹکرانے کی خبر ہم نے یوں لکھی کہ ایک مال گاڑی کاپیوں اور کتابوں (اسٹیشنری) سے بھری مسافر گاڑی سے ٹکرا گئی۔" ہمارے یہ کلاسیکل ترجمے پوری صحافی برادری میں زبان زد خواص و عوام ہیں اور تو اور ہم نے کئی شہروں کا بھی ترجمہ کر دیا ہے۔ مثلاً کئی خبروں میں ہم نیو فاؤنڈ لینڈ کو "نو دریافتستان" اور پول کو "جگر تالاب" اور آئرلینڈ کو "خفگستان" لکھ چکے ہیں۔

اور بھی کئی نکتے ہیں جو ہماری مشہور زمانہ تحقیقی کتاب "ترجمہ کے مسائل بالتصویر" میں درج ہیں۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شیخ یامین اینڈ سنز نیا بازار بہت جلد چھاپنے والے ہیں۔

www.taemeernews.com



# ترجمے کے کچھ اور مسائل

پچھلے ہفتے شائع ہونے والا ہمارا ترجمہ کے مسائل نامی مضمون اس قدر مقبول ہوا ہے کہ ہمارے پاس ہر طرف سے یہ فرمائش آنے لگی ہے کہ۔ للہ اپنی مشہور زمانہ زیر طبع کتاب "ترجمہ کے مسائل باتصویر" کے اقتباسات اور شائع فرمادیجئے ہم آپ کے بے حد ممنون و مشکور اور مرحوم مغفور وغیرہ ہوں گے۔ خط اتنے ہیں کہ سب کا فرداً فرداً جواب دینے پر اس مہنگائی کے زمانے میں دو تین روپے تو خرچ ہو ہی جائیں گے۔ اس لئے تمام فرمائش کنندگان کا ہم اس کالم کے توسط سے اس بات کے لئے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ہماری زیر طبع کتاب کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہم سے زیادہ ہمارے پبلشر جناب شیخ یامین اینڈ سنز کی حوصلہ افزائی فرمائی جو پبلک کی بے حد فرمائش پر اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع فرمانے جا رہے ہیں۔

جہاں تک اس کالم میں مزید اقتباسات شائع فرمانے کی بات ہے تو اس سے ہم معذور ہیں کیونکہ مزید اقتباسات شائع ہونے کے بعد اس کتاب میں آپ کے پڑھنے کے لئے سوائے تمت بالخیر اور گھر بیٹھے ہزاروں روپے کمانے کے گر بتانے والی کتابوں کی فہرست کے کچھ بھی باقی نہیں رہ جائے گا۔

کچھ دوستوں نے کتاب کے بارے میں چند سوالات بھی کئے ہیں۔ مثلاً گجرات سے جناب اسلم بھائی اکرم بھائی پان والا نے پوچھا ہے کہ "باتصویر" کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس میں ترجمہ کرتے ہوئے لوگوں کی تصاویر چھاپی جائیں گی؟

جواب میں عرض ہے جی نہیں صاحبان باتصویر اس کتاب کے عنوان میں اس لئے لکھا گیا ہے کہ کہ اس کے سرورق کے علاوہ جلد اور جلد پوش پر بھی

www.taemeernews.com


ہماری یعنی مصنف کی تازہ تصویر چھاپی جائے گی۔

کئی دوستوں نے نہایت کرم فرماتے ہوئے ہمیں کئی معلوماتی اور سبق آموز شکایتیں لکھ بھیجی ہیں جن سے عام فہم سلیس اور صحیح ترجمہ کے طریقوں پر بڑی عمدہ روشنی پڑتی ہے۔ یہ حکایتیں چونکہ ہم اپنی کتاب میں شامل نہیں کر سکتے (کتاب کی ضخامت پہلے ہی کافی بڑھ چکی ہے اور اب اس کے صفحوں کی تعداد ۴۸۲ تک جا پہنچی ہے) اس لئے انہیں رفاہ عامہ کے لئے یہاں درج کر رہے ہیں۔

کوٹ کپورہ سے عبدالغفور صاحب المعروف بہ عین غین سہارنپوری لکھتے ہیں ایک مرتبہ ایک مشہور شخص سمندر کی لہروں میں بہہ کر ڈوب گیا۔ انگریزی میں لہروں کو کرنٹ اور تیز لہروں کو ہائی کرنٹ کہتے ہیں۔ اس لئے اس خبر کا ایک مترجم نے یہ ترجمہ کیا۔ کل صبح فلاں صاحب ایک سمندر کے کنارے پانی میں بجلی کا کرنٹ لگنے سے موقع پر ہی مہلک طور پر ہلاک ہو گئے۔

اس حکایت سے یہ سبق ملتا ہے کہ مترجم کو نکات مستور بین السطور پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہیئے انگریزی میں چونکہ صرف کرنٹ لکھا تھا اس لئے مترجم نے نہ صرف یہ واضح کر دیا کہ کرنٹ بجلی کا تھا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ متعلقہ شخص یوں ہی نہیں بلکہ قطعی طور پر ہلاک ہو گیا۔

ہمارے مشفق و مربی جناب اوم پرکاش نامی نیوز ایڈیٹر روزنامہ تیج نے جن کے تخلص کا احترام کرتے ہوئے ہم جرائم کی خبروں میں نامی چور اور نامی بدمعاش جیسے لفظ کبھی نہیں لکھتے۔ ہمیں ایک اور عبرت ناک حکایت سنائی ہے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ تقسیم ہند سے پہلے برطانیہ میں بڑے زور کی بارش ہوئی اب چونکہ انگریزی میں جب بھی زبردست بارش ہوتی ہے تو اسے اٹ از رینگ کیٹس اینڈ ڈاگس کہتے ہیں اس لئے لاہور کے تمام اردو اخباروں میں اس خبر کا ترجمہ یوں چھپا۔ لندن میں آج صبح آسمان سے کتے بلیوں کی بارش ہوئی۔

یہ حکایت سنانے کے بعد نامی صاحب نے نہایت غم ناک لہجہ میں کہا۔ "افسوس اب ایسے صحیح اور بامحاورہ ترجمہ کرنے والے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ خدا آپ کے اور ہم سب کے ترجمہ کو روبہ صحت کرے۔ آمین۔"

www.taemeernews.com


میرٹھ سے ایک صاحب نے صحت ترجمہ کی ایک اور مثال دیتے ہوئے اپنے شہر کے ایک روزنامہ کی یہ حکایت بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ حکام نے بہت دنوں سے شہر میں حالات معمول پر رہنے کی وجہ سے آزمائشی طور پر پی اے سی کی مشق کے لئے کرفیو لگا دیا۔ اخباروں کو انگریزی میں بھیجے گئے پریس نوٹ میں لکھا گیا تھا کہ گشت یعنی پیٹرولنگ راؤنڈ دی کلاک جاری رہے گی۔ اس خبر کا ترجمہ اس طرح ہوا۔ پی اے سی گھنٹہ گھر کے اطراف میں پٹرول چھڑکتی رہے گی۔

ایک مرتبہ خود ہم نے بھی انگریزی میں کھیل کی ایک خبر کا بڑے کمال کا ترجمہ کیا۔ خبر یہ تھی کہ فٹ بال کے ایک میچ میں کچھ کھلاڑیوں نے شاندار کھیل کا مظاہرہ کرتے ہوئے "آؤٹ اسٹینڈنگ پرفارمنس" دی تھی۔ ہم نے ترجمہ کیا۔ آج فائنل میچ کے دوران کئی کھلاڑی میدان سے باہر کھڑے رہے"۔

علی گڑھ سے ایک صاحب جنہوں نے حال ہی میں جامعہ اردو کا ادیب کامل امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کرنے کے بعد نالوں کا کاروبار شروع کیا ہے لکھتے ہیں کہ بعض مترجمین انگریزی کے سیدھے سادے لفظوں کا بھی غلط ترجمہ کر دیتے ہیں اس سلسلے میں انہوں نے نمونے کے طور پر متعدد انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کے صحیح ترجمے لکھ بھیجے ہیں۔ اس نمونے کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

نمبر ۱۔ سوشل انٹرکورس۔ غلط ترجمہ۔ سماجی ربط و اختلاط۔ صحیح ترجمہ۔ سماجی مباشرت نمبر ۲۔ ارری پیریبل لاس۔ غلط ترجمہ۔ نا قابل تلافی نقصان۔ صحیح ترجمہ۔ نا قابل مرمت یا قابل نامرمت نقصان۔ نمبر ۳۔ اینیمل ہسبینڈری غلط ترجمہ۔ مویشیوں کی نسل کشی۔ صحیح ترجمہ۔ حیوانی شوہریات۔ نمبر ۴۔ بلڈی فول: غلط ترجمہ سخت احمق۔ صحیح ترجمہ۔ خونی احمق۔

www.taemeernews.com



# انصاف

پچھلے دنوں دہلی میں ججوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں کہا گیا کہ انصاف بہت مہنگا ہو گیا ہے لہٰذا موجودہ عدالتی نظام میں کچھ ایسی تبدیلیاں ہونی چاہئیں کہ انصاف حاصل کرنے کا طریقہ آسان اور سستا ہو جائے۔

صاحبو! انصاف وہ شے ہے جو ہر دور میں نادر و نایاب رہی ہے۔ کسی بھی زمانے میں یہ آسانی سے حاصل نہیں ہوا ہے بلکہ اکثر معاملوں میں تو مشکل سے بھی حاصل نہیں ہوا۔ تمام قوموں کی تاریخیں اس کی گواہ ہیں جنہیں پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ حاتم طائی کے لئے شتر مرغ کے انڈے کے برابر موتی لانا بھی اتنا مشکل نہیں رہا ہوگا جتنا کسی شہر قاضی سے انصاف پانا۔ (پتہ نہیں مورخ الف لیلہ حضرت ہومی واڈیا نے ایسے واقعات کا ذکر کیوں نہیں کیا!)

بہر کیف ججوں نے اگر یہ کہا کہ فی زمانہ انصاف بہت مہنگا ہو گیا ہے تو کوئی نئی بات نہیں کہی۔ انصاف تو جناب ہمیشہ سے مہنگا چلا آ رہا ہے۔ اسی طرح یہ تجویز بھی نئی نہیں ہے کہ انصاف کو سستا کر دیا جائے تاکہ ہر شخص کو انصاف مل سکے ماضی میں بہت سے لوگ یہ کوشش کر چکے ہیں یہ اور بات ہے کہ کامیاب کوئی نہ ہو سکا۔

کہتے ہیں مغل بادشاہ جہانگیر کو بھی ایک مرتبہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ انصاف کو سستا اور عام کر دیا جائے۔ پس یہ خیال آتے ہی ایک زنجیر اس نے اپنے محل کے

www.taemeernews.com



دروازے پر لٹکا دی اور ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جو کوئی بھی اس زنجیر کو ہلائے گا اس کے ساتھ انصاف کر دیا جائے گا۔

کئی مؤرخ آف دی ریکارڈ بتاتے ہیں کہ اس اعلان سے امراء اور جاگیرداروں میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے خاص درباریوں سے جاکر فریاد کی کہ مائی باپ اگر ہمارے مخالفوں نے یہ زنجیر ہلا دی تو ہم برباد ہو جائیں گے لہٰذا ہمارے ساتھ فوراً انصاف کیا جائے یہ لوگ اپنے ساتھ بیش قیمت نذرانے اور تحائف لے کر گئے تھے جنہیں دیکھ کر درباریوں کے دل پسیج گئے۔ چنانچہ انہوں نے محل کے پہرے داروں سے معاملہ طے کر لیا کہ خبردار ہماری اجازت کے بغیر کسی کو زنجیر ہلانے کی اجازت نہ دی جائے۔ پہرے داروں نے اس خوبی سے ہدایت پر عمل کیا کہ برسوں تک کوئی زنجیر ہلانے نہ آیا۔

ادھر زنجیر نہ ہلنے سے جہانگیر خان بہت پریشان ہوا۔ درباریوں نے اسے بتایا کہ حضور ملک میں تمام رعایا کے ساتھ انصاف ہو رہا ہے۔ اس لئے زنجیر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن بادشاہ مطمئن نہ ہوا۔ اس نے صوبہ داروں اور جاگیرداروں کو رعایا کے ساتھ تجرباتاً سخت ناانصافی کرنے کی خفیہ ہدایات جاری کیں تاکہ کوئی تو زنجیر ہلانے آئے۔ مگر پہرے دار بھی بڑے پکے تھے۔ زنجیر نہ ہلنی تھی نہ ہلی۔

آخر جب جہانگیر نے دیکھا کہ اس کی زنجیر کو بلاوجہ زنگ لگ رہا ہے تو ایک رات اس نے اپنی بیوی نورجہاں کو سہراب مودی کی "پکار" کا بالکل نیا پرنٹ منگوا کر دکھایا اور کہا کہ اے خدا کی بندی اب تو ہی کچھ کر!

نورجہاں جو کہ بڑی ذہین اور وفاشعار عورت تھی اور کبھی کبھی سابق شوہر شیر افگن کو بھی یاد کر لیتی تھی، کمال امروہوی کے ڈائلاگ سن کر بڑی متاثر ہوئی اور بادشاہ کا اشارہ سمجھ گئی چنانچہ اگلے روز اس نے فلم کے مطابق عمل کیا اور بالآخر جہانگیر کو ایک ایسا تاریخی انصاف کرنے کا موقع دلا دیا جس سے عدل جہانگیری ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مشہور ہو گیا۔ (یہ قصہ دیکھنے کے لئے دیکھیں سہراب مودی کی "پکار")

کہتے ہیں اس واقعہ کے بعد جہانگیر نے زنجیر اتروا کر شیر افگن کو قتل کرا دیا اور انصاف سے تائب ہو کر عمر بھر چین کی بنسی بجاتا رہا جو اسے چین کے بادشاہ نے

www.taemeernews.com


بطور تحفہ بھجوائی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب (زمجیر اور شیر افگن کے قتل کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ قارئین نوٹ فرمالیں!)

نادر شاہ کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ بڑا ہی منصف مزاج بادشاہ تھا۔ اس نے انصاف کے ایسے ایسے سستے اور عام ڈھنگ اپنائے کہ مورخ آج تک حیران و پریشان ہیں کہ کس کا ذکر کریں اور کس کا نہ کریں۔ ایران سے وہ چند روز کے لئے دہلی آیا تھا۔ مگر اس قلیل مدت میں ہی اس نے دہلی والوں کے ساتھ عام پیمانے پر ایسا انصاف کیا کہ لوگ آج تک یاد کرتے اور سر دھنتے ہیں اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس کے لئے عوام الناس کو جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا پڑا۔ دہلی کے کئی پکے راگیوں کو آج بھی اس بادشاہ کی تعریف میں "نادر دھن نا" نادر دھن نا، کی گردان کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔

افسوس ایران واپس جاتے وقت اس کے ایک ملازم کی رگ انصاف ایسی پھڑکی کہ اس نے اپنے بادشاہ کے ساتھ ہی انصاف کردیا اور سارا کھیل ختم ہوگیا مؤرخین کا کہنا ہے کہ یہ لاجواب بادشاہ پوری عمر زندہ رہتا تو انصاف کی اور بھی کئی نادر مثالیں قائم کرجاتا۔

خیر! آمدم بر سر مطلب۔

ججوں نے دہلی میں منعقدہ اپنی حالیہ کانفرنس میں یہ تو کہہ دیا کہ انصاف کو سستا کرنا ضروری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ انصاف سستا کیسے کیا جائے۔ خاص طور سے ان ججوں اور وکیلوں کے رہتے ہوئے جنہیں مدعیان اور مدعا علیہان سے زیادہ اپنے مفادات کا خیال رہتا ہے!۔

جج صاحبان آئے دن اپنی تنخواہوں اور بھتوں میں اضافہ کی بات کرتے رہتے ہیں تو وکیلوں کا یہ حال ہے کہ ذرا کسی موکل نے محنتانہ دیتے رقت ناک سکوڑی یہ لوگ فوراً مقدمہ خراب ہونے کا اندیشہ ظاہر کردیتے ہیں۔

خیر ججوں کی تنخواہوں کا اضافہ تو برداشت بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس کا انصاف کے سستا یا مہنگا ہونے سے کوئی سیدھا تعلق نہیں ہے۔ لیکن وکیلوں کا کیا کیجئے گا؟ ان کا تو مؤکل کی جیب سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ پھر انصاف سستا

www.taemeernews.com


کیسے ہوگا؟

اس سلسلے میں چند تجویزیں پیش ہیں۔ اگر ان میں سے ایک تجویز بھی امپلیمنٹ کردی گئی تو ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انصاف نہ صرف سستا ہوجائیگا بلکہ اس کے ملنے میں بھی کوئی تاخیر نہیں ہوگی۔

تجویز نمبر ایک یہ ہے کہ وکیلوں کو بیچ میں سے ہٹا دیا جائے نہ رہے گی بانسری نہ بجے گا بانس! جیسے ہی مدعی اور انصاف کے درمیان حائل یہ دیوار ہٹے گی لوگوں کو دھڑا دھڑ انصاف ملنے لگے گا۔

اگر یہ ممکن نہ ہو تو وکیلوں کی پرائیویٹ پریکٹس ختم کردی جائے اور تمام وکیلوں کو مع ان کے منشیوں کے پبلک سیکٹر میں لے کر ان کی ماہانہ تنخواہ مقرر کردی جائے۔

اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو کیس کی نوعیت کے لحاظ سے وکیل کی فیس مقرر کردی جائے۔ مثلاً قتل ۱۰۰۰ روپے فی پیشی۔ دوہرا قتل ڈیڑھ سو روپے فی پیشی اور تین قتل کرنے پر ۱۰۰۰ روپے کی خاص رعایت صرف ۲۰۰۰ روپے فی پیشی (قتل عمد اور قتل غیر عمد کے ریٹ بھی اسی حساب سے مقرر کئے جا سکتے ہیں) اسی طرح۔ مکان سے بے دخلی، دوسرے کی زمین پر ناجائز قبضہ، خاتمہ کرایہ داری، غبن جعل سازی اور چوری وغیرہ کے ریٹ بھی مقرر ہونے چاہئیں۔

اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو عدالتوں کی طبقاتی درجہ بندی کردی جائے۔ جس طرح ہوائی جہازوں اور ٹرینوں میں فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس ہوتی ہے۔ اسی طرح دولت مند طبقے کے لئے فرسٹ کلاس عدالتیں اور متوسط طبقے کے لئے سیکنڈ کلاس عدالتیں بنائی جا سکتی ہیں۔ آمدنی کے لحاظ سے بھی درجہ بندی ہو سکتی ہے۔ جیسے ڈی ڈی اے میں ہوتی ہے۔ اس کے مطابق ایل آئی جی، ایم آئی جی اور ایس ایف ایس (سیلف فائننگ اسکیم) عدالتیں تشکیل دی جا سکتی ہیں۔

اگر یہ درجہ بندی بھی قبول نہ ہو تو راشن کی دکانوں کی طرح سستی دروں کی عدالتیں کھولی جا سکتی ہیں۔ تاہم ایسی عدالتوں پر کافی سخت نگرانی رکھنی پڑے گی اور ہفتے میں ایک دو مرتبہ ان کا معائنہ کر کے انصاف کے نمونے بھرنے ہوں گے

www.taemeernews.com


تاکہ گیہوں کی طرح کہیں اس میں بھی ملاوٹ نہ شروع ہو جائے اور عدالت کا منتظم بڑھیا انصاف بلیک میں نہ بیچنے لگے۔

"غرض محال یہ بھی ممکن نہ ہو تو عدالتوں کو پرائیویٹ سیکٹر میں دے دیا جائے ٹاٹا، برلا، امبانی اور واڈیا اپنے آپ مسئلہ حل کر لیں گے۔ لاٹھی اور بھینس کا قدیم ترین اور برسہا برس کا آزمودہ فارمولہ رائج ہوگا تو عام آدمی کے لئے انصاف کی ضرورت ہی ختم ہو جائے گی!

اور اگر خدانخواستہ یہ بھی نہ ہو سکے تو انصاف جائے بھاڑ میں! جیسا چل رہا ہے چلنے دیجئے۔ قاضی جی دبلے کیوں شہر کے اندیشے سے؟۔

# جنازے

جس طرح زندگی ہے اسی طرح موت بھی ایک بڑے سماجی کاروبار کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ ابتدائے آفرینش سے انسان مرتا آیا ہے اور جب تک ہے تب تک مرتا رہے گا۔ جنازے اٹھتے رہیں گے، قبریں کھدتی رہیں گی۔ اظہار تعزیت ہوتا رہے گا۔ خراج عقیدت ادا ہوتے رہیں گے اور فضاؤں میں کافور مہکتا رہے گا۔

اگرچہ موت بھی زندگی کی طرح ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا، لیکن اس کے سائے میں زندگی کی کئی گتھیاں اپنے آپ سلجھ جاتی ہیں۔ موت تو خود فہم سے بالاتر رہتی ہے لیکن زندگی کے کئی راز بتا جاتی ہے۔ موت کا قرب زندگی

www.taemeernews.com



کے بارے میں انسان کی کئی غلط فہمیاں دور کر دیتا ہے۔

کسی نے کہا ہے (اور اگر نہیں کہا ہے تو اب کہہ دینا چاہیئے) کہ اگر زندگی کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہو تو جنازوں میں شرکت کیا کرو اس قول کی صداقت کا اندازہ لگانا ہے تو آزمائش شرط ہے۔ کسی جنازے میں شریک ہو کر دیکھ لیجئے ہم نے تو بار بار شریک ہو کر دیکھا ہے۔ اور پایا ہے کہ جنازے موت کا جلوس نہیں زندگی کی جھانکی ہوتے ہیں۔

جنازے میں شرکت کے بعد اور کچھ نہیں، بس کان لگا کر دوسروں کی گفتگو سنتے رہیئے، آپ کو مرحوم کی سات پشتوں سے لے کر شہر اور ملک کے حالات اور چلی و نکاراگوا کی تازہ ترین سیاسی صورت حال تک سب کچھ معلوم ہو جائے گا اور زندگی کی بے شمار حقیقتیں کھل کر آپ کے سامنے آجائیں گی۔

جنازہ کی روانگی کے بعد کچھ دیر تو خاموشی رہے گی اور جلوس کا بیشتر حصّہ میت کے قریب رہے گا۔ لیکن رفتہ رفتہ جلوس ہموار ہوتا جائے گا اور اس کا بیشتر اگلا حصہ پیچھے رہ جائے گا۔ تب آپ کو طرح طرح کی باتیں سنائی دیں گی۔

"بھئی خدا مغفرت کرے۔ بڑے ہی نیک دل انسان تھے۔ زندگی بھر کسی کا برا نہیں چاہا کسی کو دکھ نہیں پہونچایا۔"

"سچ کہتے ہو۔ بڑے میاں نے تین حج اور چار نکاح کئے! ایسی قسمت بھلا کسے ملتی ہے۔ دین میں بھی کامیاب رہے دنیا میں بھی۔ منصف مزاج ایسے تھے کہ چار شادیاں کیں مگر سوت کسی پر نہ لائے۔"

"چوتھی بیوی بے چاری پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ابھی چھ ماہ پہلے ہی تو نکاح ہوا تھا۔ سنا ہے صرف سولہ سال کی ہے۔ ہائے بے چاری کتنی چھوٹی سی عمر میں بیوہ ہو گئی۔"

"میاں سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ حاجی جی اپنے چوتھے خسر کو انڈوں کا کارخانہ کھلوا کے دے رہے تھے۔"

"انڈوں کا کارخانہ نہیں پولٹری فارم"

ہاں ہاں وہی ـــــ مرغیوں کے لئے رقم دے دی تھی مگر ابھی کارخانے

www.taemeernews.com



کی زمین کے کاغذ تیار ہونے باقی تھے کہ بلاوا آگیا۔"

"اوہو تو چوتھی اسی لئے اتنا رو رہی تھی۔"

"اور کیا، دیکھ لینا۔ تیرہویں ہوتے ہی حاجی جی کے بیٹے اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکیں گے۔"

"میاں سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ حاجی جی تیس سال پہلے اس شہر میں آئے تھے تو بالکل پھٹے حال تھے۔ سولہ سال کی جوان بیٹی گھر میں تھی۔ ایک سال بعد ہی اسے چھتے والے نواب کے نکاح میں دے دیا۔ بس کیا تھا، حاجی جی کی قسمت کا لاٹا کھل گیا نواب تو پہلے ہی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ نکاح کے ایک سال بعد بالکل ہی لڑھک گیا پھر جو حاجی جی کی ترقی شروع ہوئی ہے تو دیکھ لو۔ آج چراغ دین اینڈ سنز کا شہر بھر میں ڈنکا بج رہا ہے۔ اور پانچ کارخانے چل رہے ہیں! سیاست میں قسمت ایسی چمکی کہ چار مرتبہ میونسپلٹی کے چیئرمین چنے گئے۔"

"ہاں اب دیکھو کون آتا ہے ان کی جگہ سنا ہے سیٹھ گنگا داس کا پلہ بہت بھاری ہے۔ کروڑ پتی اسامی ہے اور آدھے سے زیادہ ممبر ساتھ ہیں۔"

"لیکن جن سنگھی اڑنگا لگا رہے ہیں۔ وہ بھی اپنا امیدوار کھڑا کریں گے۔"

"اس سے تو ہندو ووٹ بٹ جائے گا۔"

"ارے بھائی اسی لئے تو سیٹھ گنگا داس مسلمان ممبروں کے ساتھ آج کل زیادہ اٹھ بیٹھ رہے ہیں۔"

سنا ہے اسلامیہ انٹر کالج کو چندہ بھی دینے والے ہیں"۔

"بس اسی فرقہ پرستی کی سیاست نے اس ملک کا بیڑہ غرق کیا ہے۔ یہ لیڈر مذہب کے نام پر ہمیں الو بنا رہے ہیں اور ہم بن رہے ہیں دیکھ لو پنجاب میں کیا ہو رہا ہے۔ آسام میں کیا ہو رہا ہے۔ تری پورہ میں کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا ہو رہا ہے؟"

"پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن کچھ ہو ضرور رہا ہے۔ آج کل اخباروں میں بڑا نام آرہا ہے اس کا!"

"میاں ہمارے ملک کا نہیں پوری دنیا کا یہی حال ہے۔ ہر طرف افراتفری ہے کہیں بھی سکون نہیں ہے۔ ابھی بنگلہ دیش میں لڑائی بند ہوئی تھی۔ سب لوگ خوش

www.taemeernews.com



تھے کہ چلو اچھا ہوا۔ مگر اب جانتے ہو کیا ہو رہا ہے ؟"

"کیا ہے"، کئی آوازیں ایک ساتھ۔

"چلی میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"چلی میں ؟ الٰہی خیر ——— یہ کہاں ہے ؟"

"کہاں ہے ؟ ارے بھائی وہیں ہے جہاں باقی سب ملک ہیں"۔

"کہاں ؟"

——— "اٹیلس میں اور کہاں۔ کل میرا لڑکا دکھا رہا تھا۔ اچھا فضول کی باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ سگریٹ ہے ؟"

"ہاں ہے"

"تو آؤ چلو ——— ذرا اور پیچھے چلتے ہیں۔ ورنہ لوگ کہیں گے۔ جنازے میں بیڑی پی رہا ہے۔"

# ہنسی

میاں عبدالقدوس کا قول ہے کہ نیند اور ہنسی دو ایسے عمل ہیں جن پر انسان کا کوئی قابو نہیں۔ نیند سولی پر بھی اور ہنسی تعزیتی جلسے میں بھی آسکتی ہے۔ پچھلے دنوں اس قول کی وضاحت میں انہوں نے بقول خود ایک اور قول یہ کہا کہ ہر المیے کا ایک طربیہ پہلو ہوتا ہے۔ اور ہر افسوس ناک صورت حال میں ہنسی کی ایک بات چھپی رہتی ہے۔

ہم نے ان سے کہا۔ یا شیخ آپ کے دونوں قول اس بندۂ ناچیز کی سمجھ

www.taemeernews.com


ہیں نہیں آئے ہیں کیا مزید وضاحت کی زحمت فرمائیں گے ؟ سن کر کچھ متبسم ہوئے اور بولے۔

"اقوال اور قوالی ہر ایرا غیرا کی سمجھ میں آنے لگے تو ہر دوسرا آدمی ارسطو اور تیسرا حبیب پینٹر علیگڈھی بن جائے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ تم ان باتوں میں نہ سر کھپاؤ یہ فلسفے کی باتیں ہیں تمہارا تحت اللفظ نہیں!"

"مگر خاں صاحب میں آپ کا قریب ترین پڑوسی ہوں۔ اگر آپ کے اقوال زرّیں میری بھی سمجھ میں نہ آئے تو پڑوسی ہونے کا کیا فائدہ؟"۔

"میں سمجھتا تھا اخبار والوں کی عقل ٹخنوں میں ہوتی ہے۔ لیکن ان کے ٹخنے ہی نہیں ہوتے یہ آج دیکھ رہا ہوں۔ اچھا خیر سنو ـــــ دیکھو جس طرح انسان کے لئے سونا ضروری ہے۔ اسی طرح ہنسنا بھی ضروری ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ، رونا بھی انسان کے لئے ضروری ہے رونے سے ہی آدمی آدمی بنتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ رونا جانوروں کو بھی آتا ہے۔ یہاں تک کہ تمہیں گدھے بھی روتے ہوئے مل جائیں گے۔ لیکن ہنسی صرف انسان کے حصے میں آئی ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو انسان کو جانوروں سے الگ کرتی ہے۔"

"لیکن گھوڑا بھی تو ہنستا ہے" ہم نے کہا۔

"لعنت ہے تم پر! بالکل گدھے ہو۔ گھوڑوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ارے بے وقوف گھوڑا ہنستا نہیں ہنہناتا ہے۔ قدرت نے اس کو صرف یہی ایک آواز دی ہے گھوڑا جب غمگین ہوتا ہے تب بھی ہنہناتا ہے اور خوش ہوتا ہے تب بھی ہنہناتا ہے۔ اس لئے اس کے ہنہنانے کو ہنسنے سے تعبیر کرنا صریحاً غلط ہے۔ خیر ـــــ اب کچھ عقل کی بات سیکھنی ہے تو ذرا خاموش رہو۔ بیچ میں مت ٹوکو۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔"

"آپ کہہ رہے تھے کہ ہنسی ہی وہ صفت ہے جو جانوروں کو انسان سے الگ کرتی ہے۔"

"ہاں ـــــ انسان صرف اس لئے انسان ہے کہ وہ ہنس سکتا ہے۔ قہقہے لگا سکتا ہے وہاں بھی جہاں ہنسنا چاہیئے اور وہاں بھی جہاں رونا چاہیئے۔ ایک تعزیتی

www.taemeernews.com


جلسے میں مولوی دعائے مغفرت کرا رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ یا خدا مسلمانوں کو یہ توفیق دے اور وہ توفیق دے۔ مگر بے چارے کو جتنی توفیقیں یاد تھیں سب ذرا سی دیر میں خرچ ہو گئیں۔ تبھی اچانک نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ بولا۔ یا اللہ سب کو فارسی پڑھنے کی توفیق عطا فرما۔ اس پر ایک کونے سے آواز آئی۔ صرف تیل بیچنے والوں کو۔ آمین! بس پھر کیا تھا۔ مرنے والے کے وہ لواحقین بھی جو کافی دیر سے رو رہے تھے۔ بے ساختہ ہنس پڑے مگر پھر اس اندیشے سے کہ تعزیت کے لئے آئے ہوئے لوگ ان کی ہنسی کا برا نہ مان جائیں جبراً رونے لگے۔ بعد میں پتہ چلا کہ مولوی صاحب کچھ روز پہلے ایک مدرسہ میں فارسی کے مدرس مقرر ہوئے تھے۔"

"اچھا لطیفہ ہے!" ہم نے میاں عبدالقدوس کو چھیڑا۔

"لطیفہ نہیں برخوردار ——— سچا واقعہ ہے کونے سے جو آواز آئی تھی وہ اسی بندے کی تھی۔ خیر ——— دوسرا واقعہ سنو۔ پچھلے دنوں مظفر نگر میں فساد کے بعد کرفیو لگ گیا۔ یہاں ہماری بیٹھک میں اس پر گفتگو چل رہی تھی ——— سب لوگ پریشان اور فکرمند تھے کہ مظفر نگر والوں کو پتہ نہیں کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا۔ تبھی ایک صاحب بولے۔ کیا کھالہ پار میں بھی کرفیو لگا ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ ہاں بھئی لگا ہے اور کھالہ پار کیا پورے شہر میں لگا ہے یہ سن کر ان صاحب نے سرد آہ بھری اور بولے قدرت جو کرتی ہے اچھا ہی کرتی ہے۔ میں کھالہ پار میں اپنے ایک عزیز کے ہاں چند روز رہنے کے لئے جانے والا تھا۔ اچھا ہوا آخری وقت میں پروگرام بدل گیا اور وہ عزیز خود ہی ہمارے گھر رہنے آ گئے۔ اگر اس وقت وہاں ہوتا تو میں بھی کرفیو میں پھنس جاتا" سب نے ان کے خیال سے اتفاق ظاہر کیا اور کہا کہ واقعی قدرت جو کرتی ہے اچھا کرتی ہے۔ اگر آپ وہاں ہوتے تو نہ جانے بلوائیوں کے ہاتھوں کیا کیا ظلم جھیلنے پڑتے اس پر وہ بولے میاں بلوائیوں سے کون کم بخت ڈرتا ہے۔ سب سے بڑی پریشانی تو یہ ہوتی کہ کھالہ پار کی طاہری کھانے کو نہ ملتی۔ ظاہر ہے کرفیو میں وہاں کون طاہری بیچ رہا ہوگا۔ ؟"

کھالہ پار کی طاہری؟ یہ کیا بلا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

www.taemeernews.com



"بلا؟" میاں عبدالقدوس چیخ پڑے "لاحول ولاقوت۔ اماں تم آدمی ہو یا چغد؟ مظفرنگر کی طاہری کو بلا کہہ رہے ہو؟ کچھ پتہ بھی ہے۔ ایشیا بھر میں ایسی لذیذ طاہری کہیں نہیں بنتی۔ یہاں تک کہ امریکہ میں بھی نہیں ملتی!"

"اچھا!——— پھر تو دوران گفتگو وہ پریشان حال صاحب آپ ہی رہے ہوں گے"

"بے شک! اتنا باذوق بھلا اور کون آسکتا ہے اس بیٹھک میں! مگر اب چپ بیٹھو تیسرا واقعہ سنو۔ ایک صاحب چنڈی گڑھ کے پی جی آئی اسپتال میں اپنے ایک مریض کا چیک اپ کرانے گئے۔ وہاں طرح طرح کے مریضوں کی افسوس ناک اور قابل رحم حالت میں دیکھ کر ان کے دل پر بڑا اثر ہوا اور فانی بدایونی کے نہ جانے کتنے شعر یاد آگئے۔ ایک کمرے میں واحد بستر پر لیٹے ہوئے ایک تنہا مریض کو عالم نزع میں دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کانپ گئے مریض کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور سانس جھٹکوں کے ساتھ بڑی مشکل سے آرہی تھی کمرے میں کسی کو اس کی دیکھ بھال کے لئے نہ پاکر وہ صاحب دوڑ پڑے اور ایک نرس کو زبردستی پکڑ کر یہ کہتے ہوئے لے آئے کہ للہ اس کی جان بچانے کے لئے کچھ کرو۔ نرس نے مریض کو اچٹتی نگاہ سے دیکھا اور غصہ میں یہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی کہ عجیب بے وقوف آدمی ہو۔ ان صاحب نے اور ڈاکٹروں سے بھی التجا کی مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ آخر وہ بے چارے چپ چاپ مریض کے سرہانے جا کھڑے ہوئے اور دل ہی دل میں سورۂ یٰسین یاد کر کے پڑھنے کی کوشش کرنے لگے کہ اور کچھ نہیں تو بے چارے کا دم تو ساتھ ایمان کے نکل جائے۔ تبھی مریض نے زور کے جھٹکے سے آخری سانس لی۔ ان صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ سنتے ہی مریض نے آکسیجن ماسک منہ سے اتار پھینکا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ پہلے اس نے قریب کی میز سے گلاس اٹھا کر پانی پیا پھر بڑے اطمینان کے ساتھ ان صاحب سے بولا۔ کیوں بھئی کیا پریشانی ہے وہ صاحب شرمندہ ہو گئے۔ استفسار کرنے پر مریض نے بتایا کہ اس کا دمے کا علاج چل رہا ہے اور ہر ہفتے پندرہ منٹ تک آکسیجن دلا کر اس کے پھیپھڑوں کی جانچ کی جاتی ہے۔

www.taemeernews.com



اس وقت وہ اسی عمل سے گزر رہا تھا۔

"بہت خوب ـــــ وہ بیچارے صاحب بھی یقیناً آپ ہی ہوں گے؟"

"نہیں وہ میں نہیں تھا؟" میاں عبد القدوس نے کہا۔

"پھر آپ کو یہ قصہ کیسے معلوم ہوا؟" ہم نے پوچھا۔

"علاج دراصل میرا چل رہا تھا!" وہ معصومیت سے بولے۔

# افراطِ زر

کیا آپ جانتے ہیں کہ جب مہینے بھر کا راشن خریدنے کے لئے آپ پنساری کی دکان پر جاتے ہیں اور وہ سامان باندھتے ہوئے کھیسیں نکال کر بتاتا جاتا ہے کہ ارہر کی دال پر ایک روپیہ بڑھ گیا ہے۔ اُرد کی دال دو روپیہ مہنگی ہو گئی ہے صابن پر پچھتر پیسے کی چھوٹ ختم ہو چکی ہے۔ (اور یہ کہ جلد ہی وہ اگلے محلے میں بھی ایک دوکان کھولنے والا ہے تو اس کی وجہ کیا ہوتی ہے؟ اسی طرح کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ صبح سویرے جب آپ سو روپے کا نوٹ بھناتے ہیں تو وہ شام سے پہلے ہی سارے کا سارا کیوں خرچ ہو جاتا ہے؟ بھکاری کو بھیک میں دس کا سکّہ دیتے ہیں تو وہ آپ کو دعائیں دینا کیوں بند کر دیتا ہے؟ گھر میں بچہ روتا ہے تو ایک روپے سے کم میں کیوں نہیں چپ ہوتا۔؟

جی ہاں! ان تمام سوالوں کا ایک ہی جواب ہے۔ انفلیشن۔ یعنی مدرا اسپھیتی جسے اردو میں غلطی سے افراطِ زر کہا جاتا ہے۔

www.taemeernews.com


غلطی سے یوں کہ ایک مرتبہ میاں عبدالقدوس صبح صبح اخبار لہراتے ہوئے ہمارے یہاں آدھمکے ان کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ اس لئے ہم سہم گئے پھر اس سے پہلے کہ ان سے صبح صبح آنے کا سبب پوچھتے وہ خود ہی بول اٹھے۔

"مبارک ہو میاں! ایسی خبر لایا ہوں کہ سن کر خوشی سے ناچنے لگو گے۔"

ہم مزید سہم گئے اور دل ہی دل میں کانپتے ہوئے بولے۔ "لیکن ہم نے تو اس مہینے لاٹری کا کوئی ٹکٹ نہیں خریدا اور نہ ہی ہمارا کوئی قریب المرگ عزیز صاحب جائداد ہے۔!"

"اوفوہ! لعنت ہے تم پر۔ پہلے پوری بات تو سن لو۔ میں لاٹری سے بھی اچھی خبر لایا ہوں اور خبر یہ ہے کہ ہمارے ملک میں افراطِ زر ہو گئی ہے۔"

"افراطِ زر؟"، ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ "یعنی انفلیشن؟"

"ہاں بھئی یہ دیکھو۔ اخبار کے آخری صفحے پر خبر چھپی ہے کہ ملک میں افراطِ زر بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اگر یہی رفتار رہی تو آئندہ پانچ برسوں میں یہ ۵۰ فیصد بڑھ جائے گی کیا سمجھے؟ مجھے تو اخبار والوں کی عقل پر رونا آرہا ہے۔ اس خبر کو انہیں پہلے صفحے پر چھاپنا چاہیئے تھا!"

"لیکن خاں صاحب اگر یہ خبر سچ ہے تو غضب ہو جائے گا۔ جسے آپ اچھی خبر کہہ رہے ہیں وہ اس ملک کی معیشت کے لئے تباہی کا پیغام ہے۔ افراطِ زر تو وہ اقتصادی کینسر ہے جو معیشت کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے!"

"بس یہی تمہاری خراب عادت ہے۔ ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہو ارے بھائی افراطِ زر کا مطلب ہے زر کی افراط۔ جب زر کی افراط ہو گی تو سب کے پاس زیادہ پیسہ آئے گا۔ زیادہ پیسہ ہو گا تو لوگ خوش حال ہوں گے لوگ خوش حال ہوں گے تو ملک خوش حال ہو گا کیا تم یہ سیدھی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟"

"آپ غلط فہمی میں ہیں خان صاحب افراطِ زر کا مطلب پیسے کی زیادتی ضرور لیکن پیسے کی زیادتی کا مطلب خوشحالی نہیں ہے۔ افراطِ زر سے کرنسی کی قیمت گھٹ جاتی ہے اور جب کرنسی کی قیمت گھٹ جاتی ہے تو مہنگائی بڑھنے لگتی ہے اور جب مہنگائی بڑھنے لگتی ہے تو ........."

www.taemeernews.com



"اماں رہنے دو! تم تو خواہ مخواہ بال کی کھال نکال رہے ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے۔ خبر میں لکھا ہے کہ ترقی پذیر ملکوں میں صرف ہمارا ہی ایک ملک ایسا ہے جس میں اتنی افراط زر پیدا ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ اور برطانیہ جیسے ملک بھی اپنے یہاں اتنی افراط زر پھیلانے میں فیل ہو گئے ہیں۔ اور یہ تم نے کرنسی کی قیمت گھٹنے کی بات خوب نکالی۔ اس پر تو کوئی احمق بھی یقین نہیں کرے گا۔"

"آپ یقین کیجئے خاں صاحب میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں" ہم نے سمجھانے کی کوشش کی"۔

"واہ بھئی میں کیسے یقین کر لوں۔ روپیہ پہلے بھی سو پیسے کا ہوتا تھا آج بھی اتنے کا ہی ہوتا ہے۔ سو روپے کا نوٹ بھنانے پر کل بھی سو روپے ملتے تھے۔ آج بھی اتنے ہی ملتے ہیں پھر میں کیسے مان لوں کہ کرنسی کی قیمت گھٹ رہی ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے خاں صاحب۔ اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ دیکھئے، روپے کی اصل قیمت وہ نہیں ہوتی جو اس پر لکھی ہوتی ہے اصل قیمت ریزرو بنک طے کرتا ہے۔ اسے اس طرح سمجھئے اب سے تیس سال پہلے روپے کی قیمت ۷۵ پیسے تھی جو افراط زر کی وجہ سے گھٹ کر دس سال میں ۵۰ پیسے رہ گئی دس سال اور گزرے تو ۲۵ پیسے رہ گئی یہاں تک کہ اب اس کی قیمت صرف پندرہ سولہ پیسے رہ گئی ہے! اگر خدانخواستہ افراط زر اور بڑھ گئی تو جانتے ہیں کیا ہوگا؟"

"ہو گا کیا؟ لوگوں کو روپیہ مفت ملنے لگے گا اور جس کا جتنا جی چاہے گا اتنے روپے بنک سے لے آیا کرے گا۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے میاں!"

ہم نے دیکھا، وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔!

www.taemeernews.com


# عالمی ریکارڈ

حال ہی میں جنوبی ہند کے ایک باشندے نے لگاتار بولتے رہنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ٹیلی ویژن پر یہ خبر سنتے ہی ہمارا سر فخر سے اونچا ہوگیا اور ہم شکر بجالائے کہ چلو۔ کسی نے تو ایک شریفانہ اور مہذب کام کیا۔ عالمی ریکارڈ تو پہلے بھی کئی ہندستانیوں نے بنائے ہیں لیکن ان سے ہمیں کبھی خوشی نہیں ہوئی۔ خوشی ہوتی بھی کیسے؟ کسی نے مونچھ بڑھائی کسی نے ناخن بڑھائے۔ کسی نے سر کے بال لمبے کرلئے۔ بھلا بتائیے ایسے غیر مہذب اور کراہت آمیز عالمی ریکارڈ بنانے سے بھی کہیں خوشی یا فخر کا احساس کیا جاسکتا ہے؟

بولنا ہر لحاظ سے ایک مہذب کام ہے یقین نہ آئے تو مورخین سے پوچھ لیجئے۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ انسان نے اصل ترقی اس وقت شروع کی جب اس نے بولنا سیکھا اور زبان ایجاد کی اور لگاتار بولتے رہنے کی تو بات ہی نہ پوچھئے۔ اس سے اچھا کام کوئی ہے ہی نہیں۔ اور یہی ایک شعبہ ہے جس میں بلا لحاظ مذہب وملت ہم سبھی ہندستانیوں کو کمال حاصل ہے۔ سچ پوچھئے تو باتیں کرتے رہنا ہی صدیوں سے ہمارا قومی کیریکٹر ہے اور آگے بھی رہے گا۔

سرسید جیسے کئی لوگوں نے باتوں کے بجائے کام پر زور دے کر ہمارا کیریکٹر بدلنے کی کوشش کی لیکن ہم ہندستانی ایسے ارادے کے پکے اور باتوں کے دھنی نکلے کہ ان کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ ادھر یہ لوگ کوئی کام کرکے نمٹتے اور ادھر ہم

www.taemeernews.com


اس پر پانی پھیر دیتے۔

خبر بات ہو رہی تھی ریکارڈ بنانے کی۔ مذکورہ برادرِ وطن نے ہنس کے سات روز تک باتیں کر کے ہمارے قومی کیریکٹر کو عالمی پیمانے پر تسلیم کرا دیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ قوم کی حیثیت کو دوسرے شعبوں میں منوانے کے لئے ہمارے دیگر برادران وطن کیا کرتے ہیں۔

دھیان سے دیکھا جائے تو باتوں کے علاوہ اور بھی کئی ایسے میدان (کھیل کے میدان کے سوا) ہیں جن میں ہم دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہیں اور عالمی پیمانے پر ہی نہیں بلکہ ایشیائی سطح پر، یہاں تک کہ جنوبی ایشیا کی سطح پر بھی اپنی برتری ثابت کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر کرپشن کو ہی لے لیجئے۔ اس ملک میں نچلی سطح سے لے کر اوپر تک شاید ہی کوئی ایسی سطح ہو گی جس پر یہ نہ ہوتا ہو۔ منتری اپنے اپ منتری کے ساتھ کرتا ہے۔ اپ منتری سکریٹری سے کرتا ہے سکریٹری انڈر سکریٹری سے کرتا ہے۔ انڈر سکریٹری ضلع ادھیکاری سے کرتا ہے۔ ضلع ادھیکاری بلاک پرمکھ سے کرتا ہے۔ بلاک پرمکھ گرام پردھان سے کرتا ہے اور گرام پردھان گراس روٹ لیول (انگریزی کا لفظ ہے) کے ساتھ کرتا ہے۔ گراس روٹ والا بیچارہ کسی سے نہیں کر پاتا کیوں کہ اس کے نیچے کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا جس کے ساتھ وہ کرپشن کر سکے (ہائے بے چارہ وہ!) چنانچہ اسے اپنا کام نکلوانے کے لئے گرام پردھان کو رشوت دینی پڑتی ہے۔ کیونکہ گرام پردھان بلاک پرمکھ کو رشوت دیتا ہے بلاک پرمکھ ضلع ادھیکاری کو اور یہ سلسلہ کافی اوپر تک چلا جاتا ہے۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے ہندستان نے جو اتنی ترقی کی ہے تو اس کے پیچھے اصل ہاتھ کرپشن کا ہی ہے۔ اگر اس ملک سے کرپشن نکال دیا جائے تو تمام شیرازہ منتشر ہو کر رہ جائے گا اور کچھ زیادہ ملک باقی نہیں بچے گا۔

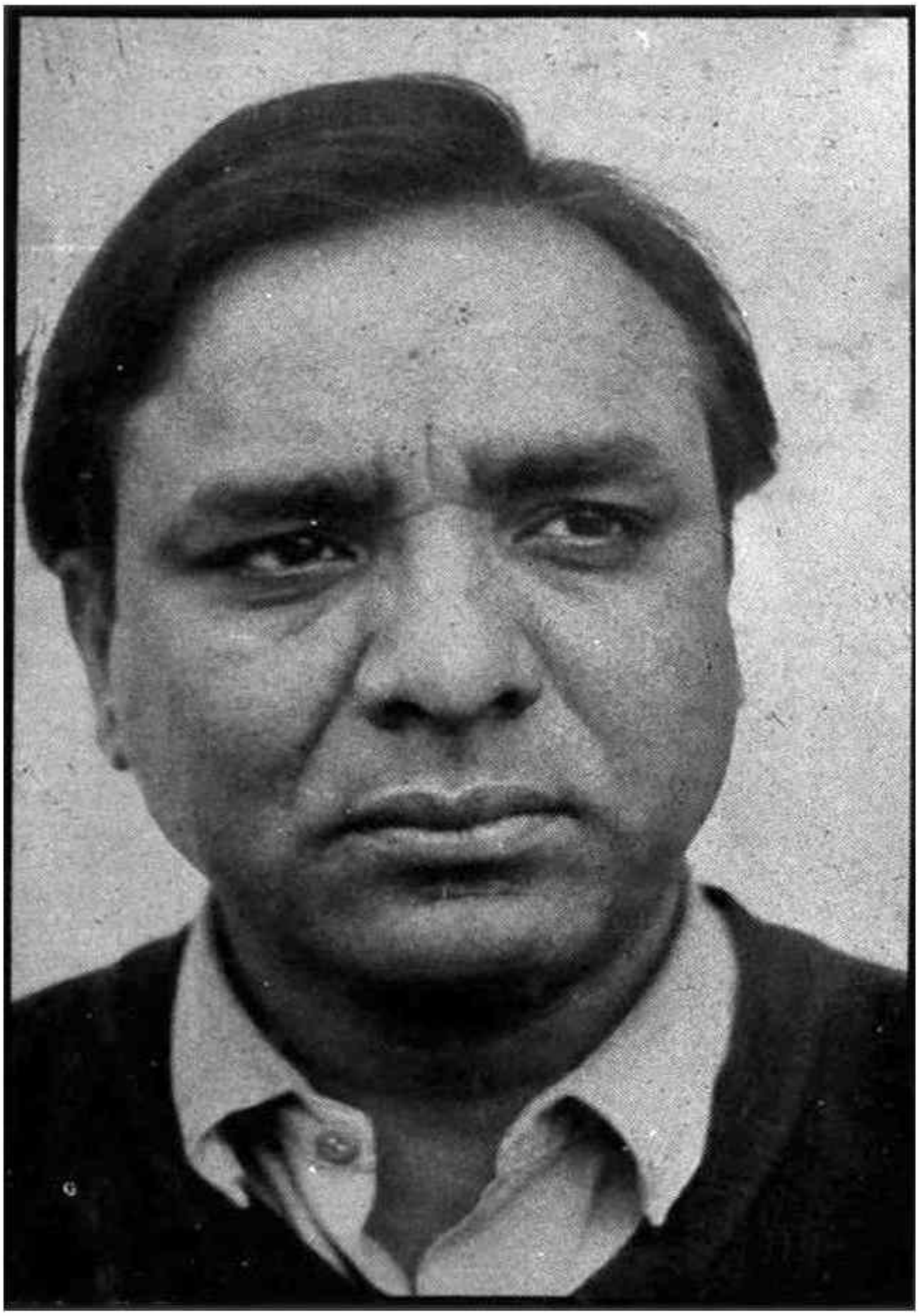

یہ اس کتاب کے مصنف نصرت ظہیر صاحب کی اپنی تصویر ہے، جس کا شائع ہونا اس کتاب کی اشاعت سے بھی زیادہ ضروری تھا۔ وجہ یہ کہ بہت سے دل پھینک قارئین کو 'قومی آواز' میں تحت اللفظ پڑھتے پڑھتے مصنف کے نام کی وجہ سے اس کے مصنف کے بارے میں کئی طرح کی غلط اور خوش فہمیاں ہو گئی تھیں جن کا ازالہ تحفظ ماتقدم کیلئے ضروری تھا اور صرف اس تصویر کی اشاعت سے ممکن تھا۔ لہٰذا یوں سمجھیے کہ یہ کتاب اس تصویر کی ہی وجہ سے چھاپی گئی ہے۔

پہلے ارادہ تھا کہ کتاب کے ہر صفحہ پر یہ تصویر چھاپی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی خوش فہمیاں دُور ہو سکیں، اور کتاب کا نام "تحت اللفظ با تصویر" رکھ دیا جائے لیکن ناشر صاحب (پبلشر صاحب) اس پر تیار نہ ہوئے۔ پتہ نہیں کیوں۔ ؟ "مصنف"